اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جولائی ۲۰۲۴ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں؟

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک ایسی اصلاحی تحریک اٹھے جو فرد کو باعمل مسلمان بنائے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو ردّ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اقدامات کرے تاکہ مسلمان دنیا وآخرت میں کامیاب ہوسکیں:

تعمیرِ فرد صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعے قرآن کا مطلوب فرد تیار کرنے کے لیے علوم کی اسلامی تشکیلِ نو۔ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کے لیے ماڈل سکول، ماڈل یونیورسٹی اور ماڈل مدرسہ کا قیام۔ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ، نیا نصاب، نئی نصابی کتب۔ تربیت اساتذہ کا نیا منہج، طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کا نظام۔ تعلیم کے ساتھ دعوت، تبلیغ اور میڈیا کا استعمال۔

اصلاحِ معاشرہ مسجد کو مرکز بنا کر مسجد کمیٹیوں کے ذریعے (فرقہ واریت کے بغیر) تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس، غربت کے خاتمے، فراہمیٔ عدل وانصاف اور بحالیٔ امن وامان کے لیے اقدامات کرنا۔ خدمت خلق کے جذبے کے ساتھ، خاموشی سے، پہلے محلے کی سطح پر، پھر شہر کی سطح پر، پھر صوبے کی سطح پر اور پھر ملک کی سطح پر۔

اسلامی ریاست ایسے افراد کی تیاری جو عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو کریں یا اہل علم سے کرائیں۔ پھر پاکستان میں اس کے نفاذ کی جدوجہد کریں اور جو موجودہ سیاسی نظام کے خاتمے، بگاڑ میں کمی لانے اور عوام کی مشکلات ومصائب کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اسی طرز پر اسلام کے معاشی، عدالتی، سماجی، قانونی نظام کی تدوینِ نو کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔

امت مسلمہ یہ کام صرف پاکستان میں نہیں سارے اسلامی ملکوں میں کرنے کے ہیں اس لیے امت کی سطح پر اس کی فکرمندی اور اس کے لیے پلاننگ بھی ضروری ہے۔

تحریک اصلاحِ المسلمین
0300-4104272

تدریس القرآن

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

سبق: ٦

آیت (٢١-٢٥)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰياتها ٢٨٦ | رُكوعاتها ٤٠

يٰۤاَيُّهَا	النَّاسُ	اعْبُدُوْا	رَبَّكُمُ	الَّذِيْ	خَلَقَكُمْ	اُردو استعمال	
اے	لوگو	عبادت کرو	اپنے ربّ کی	جس نے	پیدا کیا تمہیں	اعْبُدُوْا	عبادت، عابد، معبود
اے لوگو! اپنے رب کی عبادت واطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا						خَلَقَكُمْ	خالق، مخلوق، تخلیق

وَالَّذِيْنَ	مِنْ قَبْلِكُمْ	لَعَلَّكُمْ	تَتَّقُوْنَ (21)	الَّذِيْ	جَعَلَ	تَتَّقُوْنَ	تقویٰ، متقی، متقین
اور جو	تم سے پہلے	تاکہ تم	تم تقویٰ اختیار کرو۔	جس نے	بنایا		
اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گزرے۔ اور تقویٰ اختیار کرو							

لَكُمُ	الْاَرْضَ	فِرَاشًا	وَّالسَّمَآءَ	بِنَآءً ۖ	وَّاَنْزَلَ	الْاَرْضَ	ارض وسما، خطۂ اراضی
تمہارے لیے	زمین کو	فرش	اور آسمان کو	چھت	اور نازل کیا	فِرَاشًا	فرش، صاحب فراش
وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا، تم							

مِنَ السَّمَآءِ	مَآءً	فَاَخْرَجَ	بِهٖ	مِنَ الثَّمَرٰتِ	رِزْقًا	لَّكُمْ ۚ	الثَّمَرٰتِ	ثمر، ثمرات، مثمر
آسمان سے	پانی	اور نکالے	اس سے	پھل	رزق	لیے تمہارے		
پر آسمان سے بارش نازل کی اور جس نے تمہارے کھانے کے لیے ہر قسم کی اجناس پیدا کیں۔								

فَلَا	تَجْعَلُوْا	لِلّٰهِ	اَنْدَادًا	وَّاَنْتُمْ	تَعْلَمُوْنَ (22)	وَاِنْ	كُنْتُمْ	تَعْلَمُوْنَ	علم، عالم، معلوم، معلم
اور نہ	تم بناؤ	اللہ کے	شریک	جبکہ تم	جانتے ہو۔	اور اگر	ہو تم		
پس اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ جانتے بوجھتے۔ اور اگر تمہیں									

فِيْ رَيْبٍ	مِّمَّا	نَزَّلْنَا	عَلٰى عَبْدِنَا	فَاْتُوْا	بِسُوْرَةٍ	نَزَّلْنَا	نزلہ زکام، نزول، نازل
شک میں	اس سے جو	اتارا ہم نے	اپنے بندے پر	تو لے آؤ	ایک سورۃ	عَبْدِنَا	عبادت، عابد، معبود
اس (کتاب) میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو لے آؤ							

مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ	وَادْعُوْا	شُهَدَآءَكُمْ	مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اِنْ	كُنْتُمْ	ادْعُوْا	دعوت، داعی، مدعو
اس جیسی	اور بلا لو	گواہوں تمہاروں کو	اللہ کے سوائے	اگر	ہو تم	شُهَدَآءَ	شہادت، شاہد، شہید
اس جیسی ایک سورت اور اپنے گواہوں (حمایتیوں) کو بھی بلا لو، سوائے اللہ کے، اگر تم							بقیہ آخری صفحہ پر

صٰدِقِيْنَ (23)	فَاِنْ	لَّمْ	تَفْعَلُوْا	وَلَنْ	تَفْعَلُوْا	فَاتَّقُوا	صٰدِقِيْنَ	صداقت، صادق، صدق
سچے۔	پھر اگر	نہ	تم کر پاؤ	اور ہرگز نہیں	تم کر پاؤ گے	تو ڈرو	تَفْعَلُوْا	فعل، فاعل، مفعول
سچے ہو۔ پھر اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کرسکو گے، تو ڈرو							فَاتَّقُوْا	تقویٰ، متقی، وقایہ

النَّارَ	الَّتِيْ	وَقُوْدُهَا	النَّاسُ	وَالْحِجَارَةُ ۚۖ	اُعِدَّتْ	النَّاسُ	عوام الناس، عامۃ الناس
اس آگ سے	جو	ایندھن اس کا	لوگ	اور پتھر۔	تیار کی گئی ہے	الْحِجَارَةُ	حجرِ اسود، شجر و حجر
اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر اور جو تیار						اُعِدَّتْ	اعدادیہ، استعداد

لِلْكٰفِرِيْنَ (24)	وَبَشِّرِ	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	وَعَمِلُوا	لِلْكٰفِرِيْنَ	کفر، کافر، کفار
کافروں کے لیے	اور خوشخبری دے دو	انہیں جو	ایمان لائے	اور کام کیے	بَشِّرِ	بشارت، بشیر، مبشر
کی گئی ہے کافروں کے لیے۔ اور خوش خبری دے دو انہیں جو ایمان لائے					عَمِلُوا	عمل، اعمال، عامل

الصّٰلِحٰتِ	اَنَّ	لَهُمْ	جَنّٰتٍ	تَجْرِيْ	مِنْ تَحْتِهَا	الْاَنْهٰرُ ؕ	الصّٰلِحٰتِ	صالح، صالحین، صلحاء
نیک	کہ	ان کے لیے	باغات ہیں	بہتی ہیں	نیچے ان کے	نہریں	تَجْرِيْ	جاری، اخراجات جاریہ
اور جنہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے چشمے							تَحْتِهَا	ماتحت ہونا، تحت الشعور

كُلَّمَا	رُزِقُوْا	مِنْهَا	مِنْ ثَمَرَةٍ	رِّزْقًا ۙ	قَالُوْا	هٰذَا		
جب کبھی	رزق دیے گئے	اس سے	پھل	بطور رزق	انہوں نے کہا	یہ		
بہتے ہوں گے۔ جب کبھی ان کو وہاں کھانے کو پھل دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے								

الَّذِيْ	رُزِقْنَا	مِنْ قَبْلُ ۙ	وَاُتُوْا	بِهٖ	مُتَشَابِهًا ؕ	رُزِقْنَا	رزق، رازق، رزّاق
جو کہ	رزق دیے گئے ہم	اس سے پہلے	اور وہ دیے گئے	اس سے	ملتے جلتے	مُتَشَابِهًا	متشابہ، تشبیہ، شباہت
اس طرح کے پھل تو ہم پہلے کھا چکے ہیں (دراصل) انہیں دنیا سے ملتے جلتے پھل							

وَلَهُمْ	فِيْهَآ	اَزْوَاجٌ	مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ	وَّهُمْ	فِيْهَا	خٰلِدُوْنَ (25)	اَزْوَاجٌ	زوجہ، ازدواجی زندگی
اور ان کے لیے	اس میں	بیویاں	پاکیزہ	اور وہ	اس میں	ہمیشہ رہنے والے۔	مُّطَهَّرَةٌ	طہارت، طاہر، طہارت خانے
دیے جائیں گے اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوگی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔							خٰلِدُوْنَ	خالد، خلود، خالدہ

ماہنامہ **البرہان** لاہور

Since 2010

جلد ۲۸ — شمارہ ۷

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

جولائی ۲۰۲۴ء/ ذی الحجہ ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

☜ فکرونظر

- غزہ! تُو زندہ رہے گا — مدیر — ۴
- تحریک اصلاحِ المسلمین — ۵

☜ مقالۂ خصوصی

اسلام اور مسلمانوں کا احیائے ثانی (نشأۃ ثانیہ) — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۷
مسلمان ابھی تک زوال سے کیوں نہیں نکل سکے؟ کیسے نکل سکتے ہیں؟ اور مغرب کیوں غالب ہے؟

☜ تعلیم و تربیت

- 'فلم' عمروعیار- چند ہوش ربا انکشافات — حافظ محمد عمران طحاوی — ۲۰
ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فلم پر فوراً پابندی لگائی جائے
- مدرسہ ڈسکورسز — مفتی یاسر ندیم الواجدی — ۲۴
- تعلیم و تربیت اور دینی عناصر کی غفلت — مدیر — ۲۷
- پاکستان میں تعلیم: تازہ اعداد و شمار — ادارہ — ۲۸

☜ تفہیم دین

- جائز اختلاف اور گمراہی میں فرق — مدیر — ۲۹
ان سکالرز اور علماء کے لیے جو جاوید غامدی اور عمار ناصر کو گمراہ نہیں سمجھتے
- تجدد دیوبندی مزاج کے خلاف ہے — محمد عرفان ندیم — ۳۷
- غامدی فکر کی بنیادی گمراہی کیا ہے؟ — مولانا یحییٰ نعمانی — ۴۰
- دین کا کام کرنے والے اکٹھے کیوں نہیں ہوتے؟ — محمد ادریس — ۴۷

☜ فکرودانش

محکوم قوم کی نشاندہی — علامہ ابن خلدون — ۴۸

☜ اسلام اور مغرب

- سرمایہ دارانہ نظریۂ ضرورت- ایک اسلامی محاکمہ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۹
- عالمِ اسلام میں مغرب جیسی ترقی کیوں ممکن نہیں؟ — سید خالد جامعی — ۶۰

☜ عالم اسلام

مسئلہ فلسطین- تاریخی پس منظر اور حقائق — ڈاکٹر شمس الحق حنیف — ۶۶

English Section — ۸۲
Implication of the 2024-25 Budget
Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

غزہ! تُو زندہ رہے گا

* حماس کے مجاہدین کو آفرین

* پچاس مسلمان ممالک کے بے حمیت حکمرانوں پر لعنت

* دوارب مسلمانوں کی شرمناک خاموشی۔ کہ ان سے زیادہ بڑے جلوس کافر ملکوں میں نکل رہے ہیں۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں غیر مسلم طلبہ کے احتجاج نے حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے لیکن کتنی مسلم یونیورسٹیوں کے طلبہ نے جلوس نکالا ہے؟

* ثابت ہوا کہ ان پچاس مسلم اکثریتی ممالک میں نہ اسلام ہے، نہ جمہوریت۔ اگر مسلم حکمران امریکہ اور مغرب کے لے پالک ہیں، فکری اور عملی غلام ہیں تو عوام اور علماء نے کیوں ان کو خوابِ غفلت سے نہیں جگایا؟ کیوں ان کو مجبور نہیں کیا کہ وہ فلسطینیوں کی مدد کریں؟ پاکستان کی دینی جماعتیں مل کر ایک جلوس نہ نکال سکیں۔

* غزوہ زندہ رہے گا۔ حماس کے مجاہدین کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ۔ ۴۰ ہزار شہیدوں اور ۶۰ ہزار زخمیوں کے ساتھ، بھوک سے بلکتے بچوں کی معیت میں حماس کے مجاہدین پچھلے ۶ مہینے سے جہاد کر رہے ہیں۔ وہ ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے لیکن پچاس سے زائد مسلم ممالک کے حکمران اور دوارب مسلمان دنیا میں تو ذلت و مسکنت سہہ ہی رہے ہیں، کل بروز قیامت اللہ کے حضور کیا جواب دیں گے؟

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں؟

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک ایسی اصلاحی تحریک اٹھے جو فرد کو باعمل مسلمان بنائے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو ردّ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اقدامات کرے تا کہ مسلمان دنیا وآخرت میں کامیاب ہوسکیں:

تعمیرِ فرد: صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعے قرآن کا مطلوب فرد تیار کرنے کے لیے علوم کی اسلامی تشکیلِ نو۔ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کے لیے ماڈل سکول، ماڈل یونیورسٹی اور ماڈل مدرسہ کا قیام۔ تعلیمی ثنویت کا خاتمہ، نیا نصاب، نئی نصابی کتب۔ تربیت اساتذہ کا نیا منہج، طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کا نظام۔ تعلیم کے ساتھ دعوت، تبلیغ اور میڈیا کا استعمال۔

اصلاحِ معاشرہ: مسجد کو مرکز بنا کر مسجد کمیٹیوں کے ذریعے (فرقہ واریت کے بغیر) تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس، غربت کے خاتمے، فراہمیٔ عدل وانصاف اور بحالیٔ امن وامان کے لیے اقدامات کرنا۔ خدمت خلق کے جذبے کے ساتھ، خاموشی سے، پہلے محلے کی سطح پر، پھر شہر کی سطح پر، پھر صوبے کی سطح پر اور پھر ملک کی سطح پر۔

اسلامی ریاست: ایسے افراد کی تیاری جو عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو کریں یا اہل علم سے کرائیں۔ پھر پاکستان میں اس کے نفاذ کی جدوجہد کریں اور جو موجودہ سیاسی نظام کے خاتمے، بگاڑ میں کمی لانے اور عوام کی مشکلات ومصائب کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اسی طرز پر اسلام کے معاشی، عدالتی، سماجی، قانونی نظام کی تدوینِ نو کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔

امت مسلمہ: یہ کام صرف پاکستان میں نہیں سارے اسلامی ملکوں میں کرنے کے ہیں اس لیے امت کی سطح پر اس کی فکرمندی اور اس کے لیے پلاننگ بھی ضروری ہے۔

تحریک اصلاحِ المسلمین

0300-4104272

غزہ لہُو لہُو

عید کر سکتا نہیں

دیکھ کر غزہ کی حالت، عید کر سکتا نہیں
جشن کرنے کا ابھی مَیں حوصلہ رکھتا نہیں

ہر طرف بچوں کے لاشے اور بریدہ جسم ہیں
ظلم کے فن سے تراشیدہ، کشیدہ جسم ہیں
دیکھ کر یہ سب، خوشی کا حوصلہ پڑتا نہیں

آؤ لے جاؤں مقدس سرزمینوں پر تمھیں
کیا نظر آیا سلامت کوئی بھی اک گھر تمھیں
تم نے پوچھا ہے کہ اتنے دن سے مَیں ہنستا نہیں

ہوگئے شعبِ ابی طالبؓ کے منظر رونما
بھوک کی شدت سے دیکھو گھاس انھوں نے کھالیا
موسموں کی شدتوں میں سر پہ بھی سایا نہیں

کوئی زنگی، کوئی ایوبی، یا کوئی بیبرس
مَیں پکارے جارہا ہوں اور بجاتا ہوں جرس
اک بھی غیرت مند حاکم کیا کوئی زندہ نہیں؟

مقالۂ خصوصی　　پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

مسلم نشأۃ ثانیہ یا

اسلام اور مسلمانوں کا احیائے ثانی

مسلمان ابھی تک زوال سے کیوں نہیں نکل سکے؟ کیسے نکل سکتے ہیں؟ مغرب کیوں غالب ہے؟

۵ مئی ۲۰۲۴ء کو لاہور کی مرغزار ہاؤسنگ سوسائٹی کے بعض ذی علم افراد نے ہمیں مسلم نشأۃ ثانیہ کے موضوع پر گفتگو کی دعوت دی۔ یہ موضوع اہم بھی ہے اور طویل بھی اور ہم نے کئی سال تک سوچ بچار کے بعد اس موضوع پر لکھا اور اس پر ہماری ۴۰۷ صفحات کی ایک کتاب پہلی دفعہ ۲۰۰۶ء میں کتاب سرائے اُردو بازار لاہور نے ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'' کے نام سے شائع کی۔ اس ایڈیشن کے خاتمے پر اسلامی جمعیت طلبہ نے اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن مکتبہ البرہان نے شائع کیا ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن بھارت کے ایک مسلمان پبلشر نے ہم سے پوچھے بغیر چند سال پہلے شائع کیا اور اب ہماری اجازت سے اس کا ایک ایڈیشن لکھنو سے شائع ہو رہا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ دس بارہ صفحات میں اس موضوع پر ایک مختصر مقالہ لکھ دیا جائے تا کہ قارئین البرہان اسے ایک نشست میں پڑھ سکیں۔ جو احباب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ہماری مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کریں۔

تفہیمِ موضوع

موضوع دراصل یہ ہے کہ مسلمان ابھی تک زوال سے کیوں نہیں نکل سکے اور کیسے نکل سکتے ہیں؟ اسلام کے احیائے ثانی اور مسلمانوں کے احیائے ثانی میں ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں کیونکہ مسلمانوں کا عروج اسلام پر عمل سے مشروط ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جس سنت پر عمل نہ ہو رہا ہو، اس پر از سر نو عمل کرنے کو اس کے احیاء سے تعبیر کیا ہے[1] لہٰذا اسلام پر عمل نہ کرنے سے مسلمانوں کو جو زوال آیا، اس سے نکلنے اور اس پر عمل کرنے کو احیائے

[1] اخرجہ الترمذی وحسنہ، رقم الحدیث: ۲۶۷۷

اسلام یا احیائے مسلمین کہنا غلط نہیں۔ گویا احیائے اسلام اور احیائے مسلمین دونوں مترادف ہیں۔

بعض احباب 'نشأۃ ثانیہ' کے الفاظ کے ساتھ مسلم یا اسلام کے سابقے کو نامناسب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں 'نشأۃ ثانیہ' ترجمہ ہے مغربی اصطلاح رینے سان (Renaissance) کا جو مغرب کی نشأۃ ثانیہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح ہے اور ہم 'اسلامی جمہوریت' اور 'اسلامی سوشلزم' یا 'مسلم جمہوریت' اور 'مسلم سوشلزم' جیسی اصطلاحات کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے ہم نے 'اسلام اور مسلمانوں کا احیائے ثانی' کے الفاظ استعمال کیے ہیں البتہ 'مسلم نشأۃ ثانیہ' کی اصطلاح زیادہ مروج ہونے کی وجہ سے اس کا بھی ضمناً ذکر کر دیا ہے۔

موضوع کی وسعت کے پیش نظر ہم اس پر مندرجہ ذیل عناوین کے تحت بحث کریں گے: مسلم عروج کے اسباب، مسلم زوال کے اسباب، مسلم عروج کی حکمت عملی، قرآن وسنت کی رو سے قوموں کے عروج وزوال کا فلسفہ، مغرب کا غلبہ کیوں؟ ہم زوال سے کیوں نہ نکل سکے؟ ہم زوال سے کیسے نکل سکتے ہیں؟ وغیرہ۔

مسلم عروج کے اسباب

ہمارا موضوع یہ ہے کہ مسلمانوں کو زوال کیوں آیا اور وہ اس سے نکل کر دوبارہ اسلام کا غلبہ کیسے پا سکتے ہیں؟ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ صدر اوّل میں مسلمانوں کو عروج اور غلبہ کیسے ملا؟ اس کا بہترین جواب وہ تقریر ہے جو حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دوبار میں کی تھی کہ ہمارے اندر یہ اور یہ اخلاقی خرابیاں تھیں، اللہ نے اپنا پیغمبر ہم میں مبعوث فرمایا اور اب ہم میں یہ اور یہ خوبیاں پیدا ہو گئیں ہیں۔ (۱) ہم بغیر کسی فلسفیانہ بحث اور ادق اصطلاحات کے استعمال کے، آپ کو سادہ اور صاف الفاظ میں بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کی تعلیم دی اور اسی تعلیم کے مطابق ان کے نفوس کا تزکیہ کیا تو پتھروں کو تراش کر ہیرے بنا دیا اور بدوؤں کو مہذب اور راہزنوں کو قوم کا رہنما بنا دیا۔ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کام کا جو فارمولا عطا فرمایا، وہ تھا: ﴿یُعَلِّمُھُمُ

(۱) مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۲۴۹۸

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کام اللہ تعالیٰ کی براہ راست رہنمائی میں کیا۔ ایک فرد سے کام شروع کیا اور یہ کام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۵ سال کی محنت کے بعد بدر میں جب کفار قریش سے مقابلہ ہوا تو ان کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محنت اور صحابہ کرام کے تعاون اور ایثار وقربانی سے مسلم معاشرہ بھی قائم ہوگیا اور مسلم ریاست بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ہی میں سارا جزیرۃ العرب مسلمان ہوگیا اور آپ کے تیار کردہ خلفاء راشدین نے دو دہائیوں سے بھی کم عرصے میں ایران اور روم تک اسلام پہنچا کر انہیں مطیع کرلیا۔

اس قوت وطاقت کا منبع کیا تھا؟ ایمان کی قوت، اسلام پر عمل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت۔ اسلام نے سادہ لوح بدوؤں کے اندر موجود Human Potenial کو جلا بخشی اور ان کے اندر اخلاق واقدار وکردار کی وہ طاقت ابھر کر نمایاں ہوگئی جس پر دنیا میں قطع اسباب کا انحصار ہے جیسے صدقِ مقال، محنت کی عادت، ایثار وقربانی، اطاعتِ امیر، نظم وضبط، پابندئ قانون وغیرہ۔ اقبال نے کہا تھا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

علماء اسلام نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کے لیے جزیرہ نما عرب ہی کیوں چنا؟ اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحرائے عرب کے بدوؤں میں Human Content اپنی اصل فطرت پر بحظِ وافر موجود تھا، جسے اسلامی تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت نے صیقل کر کے چمکا دیا اور ایسے انسان وجود میں آئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انہی میں شامل تھے ابوبکرؓ وعمرؓ جیسے سیاسی مدبر، حضرت عثمانؓ جیسے سخی اور حضرت علیؓ جیسے قاضی، حضرت خالدؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ جیسے سپہ سالار، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے ماہر قرآن ولغت اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے زاہد وقس علی ذلك۔

مسلم زوال کے اسباب

یہ قول حضرت امام مالکؒ سے منسوب ہے کہ مسلمان قوم کی آخری زمانے میں اصلاح

اسی طریقے سے ہوگی جس طرح ابتداء میں ہوئی تھی۔ یوں ہم بسہولت کہہ سکتے ہیں کہ جن عوامل کی وجہ سے ابتداء میں مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا تھا، ان کے فقدان سے وہ زوال کا شکار ہوگئے اور ان کو ابتداء میں عروج ملا تھا ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ سے۔ یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس سے ایسے فرد کی تیاری جو ایمان کی قوت سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دے، جو ذاتی زندگی ہی میں نہیں معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی اصولوں پر چلائے؛ تاکہ وہ آخرت میں اللہ کے حضور سرخرو ہو سکے۔ معاشی بدحالی، سیاسی عدم استحکام، سائنس وٹیکنالوجی سے غفلت، تحقیق کی بجائے تقلید وجمود کا رویہ وغیرہ یہ سب اسی اصل کی فروع ہیں۔ ایمان کی کمزوری کی وجہ بھی تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کا صحیح خطوط پر قائم نہ رہنا تھا۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ یہی داخلی امر تھا، تاہم ان کے زوال کی تکمیل میں اور ان کی ہلتی ہوئی دیوار کو دھکا دے کر گرانے میں ایک خارجی عنصر بھی شامل ہوگیا اور وہ مغرب کا غلبہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے کہ اس نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آخری نبی قرار دیا، دین کو مکمل کر دیا، اسے باقی ادیان پر غالب کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دین ودنیا کی بادشاہی عطا فرمائی۔ یہود ونصاریٰ اور کفار کو شکست ہوئی۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے بعد اموی، عباسی اور عثمانی مسلم حکمرانوں نے بھی انہیں ابھرنے نہ دیا لیکن جب وہ کمزور ہوگئے تو یورپ کے مسیحیوں نے حالات کو بدل دیا اور وہ خوب طاقتور ہوگئے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں، عربوں کو ترکوں سے لڑایا کئی مسلمان گروہوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست دے کر خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا اور مسلمان ملکوں پر قابض ہوگئے، انہیں غلام بنالیا اور انہیں مستقل غلام بنائے رکھنے کی کامیاب پلاننگ کی۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بظاہر آزاد ہونے والے مسلم ممالک، تقریباً سب کے سب، آج بھی مغرب کے فکری اور عملی غلام ہیں اور مغرب کی پوری کوشش ہے کہ مسلمان ممالک مجتمع نہ ہوں، وہ مالی اور حربی طور پر طاقتور نہ ہوں، خصوصاً مسلم معاشرے کے مؤثر طبقات ان کی فکری غلامی سے نہ نکل سکیں۔

دوبارہ عروج کی حکمت عملی

جسے ہم اسلام اور مسلمانوں کا احیائے ثانی یا نشأۃ ثانیہ کہہ رہے ہیں، اس کی حکمت عملی وضع کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ اصولاً یہ وہی حکمت عملی ہے جس سے صدر اوّل میں اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور یہ وہی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے یعنی اسوۂ نبوی کے مطابق تعمیرِ فرد/تعمیرِ شخصیت/تعمیرِ کردار اس طرح کہ فرد نہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے بلکہ معاشرے اور ریاست میں بھی اس کا کردار اسلامی ہو اور معاشرہ چونکہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں اس لیے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اگر صاحب ایمان اور صاحب کردار افراد تیار کر لیے جائیں تو معاشرہ اور ریاست کا مطابقِ اسلام ہو جانا لازمی ہے اور اس کے لیے خصوصی کوششیں بھی کی جاسکتی ہیں۔ تو گویا اسلام اور مسلمانوں کو عظمت رفتہ کی بازیابی کا پہلا اصول یہ ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت (دعوت، تبلیغ، میڈیا) اور تزکیۂ نفس (تربیت، اصلاح) سے مسلمانوں کے اندر ایمان کی آبیاری کی جائے انہیں دین سے جوڑا جائے، اور انہیں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کے لیے متحرک کیا جائے۔

عصرِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء ثانی کا دوسرا اصول ہے مسلمانوں پر کفر (یعنی مغرب کی الحادی فکر وتہذیب) کے غلبے کو ردّ کرنا اور اس کفر کے علم بردار مغربی ممالک کے عالم اسلام پر غلبے کو ردّ کرنا۔ یہ کام دو سطحوں پر ہونا چاہیے۔ ایک علمی وفکری سطح پر مغربی فکر وتہذیب کی بالادستی کو چیلنج کرنا اور اسلام کو اس سے بہتر اور برتر ثابت کرنا اور دوسرے سیاسی، معاشی اور حربی طور پر مغرب کے غلبے کو چیلنج کرنا۔ اس کے لیے ظاہر ہے زندگی کے ہر شعبے میں خصوصاً سیاست، معیشت اور دفاع کے شعبوں میں کام کرنا ہوگا لیکن اس کی ابتداء، جیسا کہ ہم نے کہا، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس ہی سے کرنا ہوگی بصورت دیگر گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ہم زوال سے کیوں نہیں نکل سکے؟

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ یہیں اس سوال پر غور کر لیا جائے کہ

مسلمان ایک صدی کی کوششوں کے باوجود (خاتمۂ خلافت ۱۹۲۴ء اور یہ تحریر ۲۰۲۴ء) مسلمان امت زوال سے کیوں نہیں نکل سکی اور اسلام اور مسلمان غالب کیوں نہیں آسکے؟

یہ سوال اٹھانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ بلاشبہ اس کے لیے کوششیں ہوئی ہیں اور ان کے کچھ مثبت نتائج بھی نکلے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوششیں ریاستی سطح پر سیاسی، معاشی اور حربی شعبوں میں زیادہ نہیں ہوئیں کیونکہ سیاسی، معاشی اور حربی سطح پر مسلمان حکمران مغرب کے شکنجے سے نہیں نکل سکے یا بہت کم نکل سکے ہیں۔

علمی، فکری، دینی اور اخلاقی سطح پر دینی تحریکوں اور جماعتوں نے جو کوششیں کی ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں اور مستحق ستائش ہیں لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ درپیش دونوں چیلنجز یعنی داخلی اور خارجی سے کماحقہ نبردآزما نہیں ہوسکیں۔ ہم نہایت اختصار سے دینی قوتوں کی حکمت عملی پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

اصلاحی و تبلیغی جماعتیں: ان میں تبلیغی جماعت غالباً سب سے قدیم، بڑی اور عالمگیر ہے۔ بلاشبہ اس کے مفید اثرات بھی ہیں لیکن اس بات سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں کہ اس نے اصلاح اور تعمیرِ سیرت کو دین کے ابتدائی اور انفرادی تقاضوں تک محدود رکھا ہے اور اسے معاشرے اور ریاست کے اسلامی کردار سے کوئی غرض نہیں۔ اگر یہ پالیسی اپنانا انگریزی دور میں اس کی مجبوری تھی تو پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کی آزادی کے بعد اس جزء کو ترک کرکے پورے اسلام کی طرف واپسی ضروری تھی لیکن یہ نہیں ہوسکا۔

جدید دینی تحریکیں: جدید دینی تحریکوں میں شرق اوسط میں الاخوان المسلمون اور پاکستان (بلکہ برصغیر پاک وہند) میں جماعت اسلامی کا کردار نمایاں ہے۔ پاکستان کی سیاسی اور دینی زندگی میں بلکہ بیرونِ ملک بھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی خدمات اور اثرات انتہائی قابل قدر ہیں اور انہوں نے جدید اسلوب اور نئے استدلال سے دین کو پیش کرکے بہت سے جدید پڑھے لکھے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا ہے لیکن وہ عالمِ اسلام میں کہیں بھی خصوصاً پاکستان میں، اسلامی ریاست قائم نہیں کرسکے۔ ہماری رائے میں، دو وجوہ سے ان کی جدوجہد نتیجہ خیز نہیں ہوئی۔ ایک یہ کہ مولانا مودودی نے مسلمانوں کو دینی سیاسی

جدوجہد کی طرف مائل کرنے کے لیے اسلام کی جونئی سیاسی تعبیر کی اسے جمہور علماء نے تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت کی۔ اور دوسرے مولانا نے سیاسی میدان میں اسلام کے سیاسی نظام کی بازیافت کی بجائے مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کو قبول کرلیا اور اس میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا حالانکہ اسلام اور کفر کا یہ اجتماع علمی وفکری طور پر ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں پاکستان میں اسلام تو نہیں آیا البتہ جمہوریت کے ذریعے مغربی تہذیب کے الحادی افکار واقدار پاکستانی معاشرے پر غالب آ گئے ہیں۔

دینی مدارس: دینی مدارس نے غلام ہندوستان میں اسلام کی بقاء کے لیے شاندار اور کامیاب جدوجہد کی ۔ ان کے نظام تعلیم میں مکمل اسلام نہ تھا۔ اگر دیوبند کے قیام کے وقت انگریز حکومت کے غلبے کی وجہ سے دینی مدارس کی کچھ مجبوریاں یا عُذر تھے بھی تو قیام پاکستان کے بعد وہ ختم ہو گئے لیکن نہ حکومت پاکستان نے نظام تعلیم بدلا اور نہ علماء کرام نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس آج بھی ریاست کے لیے افراد تیار نہیں کرتے اور معاشرے میں بھی صرف مساجد و مدارس کو آباد رکھنا ہی ان کا محدود ایجنڈا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے پاکستان میں اسلامی سیکولرزم کو فروغ ملا ہے اور ریاست کو اسلامی بنانے کی جدوجہد نا کام ہوئی ہے۔

تصوف کے حلقے: پاکستانی معاشرے میں تصوف کے حلقے بالعموم دور متاخرین کے اسی تصوف کو لے کر چل رہے ہیں جس میں بہت کچھ غیر اسلامی رسوم ورواج اور افکار کی آمیزش ہو چکی ہے بلکہ اس کی خرابیوں میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لیے کوئی بڑی تحریک نہیں چلی کہ اس میں بہتری کی صورت پیدا ہوتی۔

حربی مزاحمت: القاعدہ اور داعش جیسی بڑی تنظیموں نے مغرب کی عملی مزاحمت شروع کی لیکن وہ مغرب کے پروپیگنڈے اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کی نذر ہو گئیں۔ البتہ افغان طالبان نے چالیس سال تک جان و مال کی قربانیاں دے کر اور گوریلا جنگ لڑ کر پہلے روس اور پھر امریکہ ویورپ کو شکست دی۔ اسی طرح ایران مغرب کی حمایت سے چلنے والی شاہی حکومت کو داخلی طاقت سے شکست دینے میں کامیاب ہوا۔

خلاصہ یہ کہ جن علماء کرام اور جن دینی جماعتوں نے مسلمانوں کی اصلاح یا اسلام کے

غلبے کی کوشش کی یا تو ان کا تصورِ دین ناقص تھا اور ان کی اصلاح کی حکمت عملی ناقص تھی یا انہوں نے متفق علیہ امور میں مسلمانوں کی خاطر خواہ اصلاح نہیں کی۔ مثلاً اس میں دینی جماعتوں میں کوئی اختلاف نہیں کہ مسلمانوں کو قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے لیکن علماء کرام اور دینی جماعتوں کی پوری کوشش کے باوجود، ایک محتاط اندازے کے مطابق (کیونکہ مصدقہ اعداد و شمار موجود نہیں) پاکستانی مسلمانوں میں سے اندازاً ۶۰ فیصد ناظرہ قرآن پڑھ سکتے ہیں، تقریباً ۱۰ فیصد ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھے ہوئے ہیں اور جو مسلمان قرآن کی عربی عبارت سمجھ کر پڑھ سکتے ہیں ان کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں۔ یہی حال نماز کا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ۱۰ فیصد لوگ بھی جماعت سے نماز نہیں پڑھتے اور صرف ایک فیصد کو نماز کا ترجمہ آتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تجدید سے قطع نظر متفق علیہ امور میں بھی مسلمان عوام پر علماء کرام اور دینی جماعتوں کے اصلاحی اثرات کتنے کم ہیں۔ کیا یہ سوچنے اور فکر مند ہونے کا مقام نہیں؟

پس چہ باید کرد: حل کیا ہے؟

جیسا کہ پچھلی گفتگو سے واضح ہے کہ حل صرف یہ ہے کہ صحیح تعلیم و تزکیہ سے ہر مسلمان کا ایمان پختہ کیا جائے تاکہ وہ عملی مسلمان (Practicing Muslim) بن جائے۔ اسلام پر عمل اس کی پہلی ترجیح بن جائے اور وہ غیر اسلامی افکار و اعمال (خصوصاً مغربی فکر و تہذیب) کو ردّ کر دے۔ اس کا اظہار نہ صرف فرد کی سطح پر ہو بلکہ معاشرے اور ریاست کی سطح پر بھی ہو۔ یہ پوری بات ہے اور واضح ہے۔ تاہم بعض کم فہموں کے شرحِ صدر کی خاطر ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں:

۱۔ **تعمیرِ فرد:** یہ بنیادی ترین کام ہے۔ تعلیم / دعوت / تبلیغ / میڈیا اور تزکیہ نفس / تربیت / اصلاح کے ذریعے فرد کی تعمیر شخصیت و کردار اس طرح کی جائے کہ آخرت کی کامیابی اس کی ترجیح اوّل بن جائے اور ذاتی زندگی اور معاشرے و ریاست کی سطح پر اسلامی تعلیمات پر عمل اور مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کا ردّ اس کا ہدف بن جائے۔ یہ کام حکومت کے کرنے کا بھی ہے اور علماء کرام اور دینی جماعتوں کا ہدف بھی یہی ہونا چاہیے۔

۲۔ **اصلاحِ معاشرہ:** فرد کی تعلیم و تربیت جب اسلامی ہو اور وہ اپنی ذاتی زندگی میں

اسلام پر عمل کرنے لگے تو اگلا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ پورا معاشرہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور معاشرتی رسوم و رواج مطابقِ اسلام ہوں۔ یہ بھی حکومت، علماء کرام اور دینی جماعتوں کے کرنے کا کام ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ چونکہ موجودہ مسلم ریاست اور مغرب زدہ مسلمان حکمران ریاستی سطح پر نفاذ شریعت کا کام نہیں کرتے اس لیے علماء کرام اور دینی جماعتوں کو معاشرتی تنظیم کے ذریعے یعنی معاشرے کو منظم کرکے پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم و تدریس، امن و امان، عدل وانصاف، غربت میں کمی اور خدمتِ خلق/ رفاہِ عامہ کے کاموں کو منظم کرنا چاہیے۔ ہم یہ الفاظ سوچ سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں کہ اگر فرد کی تربیت اسلامی خطوط پر ہو اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے خاموشی سے (حکومت کی اتھارٹی کو چیلنج کیے بغیر) مسجد کو مرکز بنا کر، نمازیوں کی کمیٹیوں کے ذریعے، یہ کام منظم انداز میں کیے جائیں تو ۸۰ فیصد اسلام نافذ ہوسکتا ہے اور اس کی برکات حاصل ہوسکتی ہیں۔

۳۔ اسلامی ریاست: مسلمانوں کی ریاست [۱] کا اسلامی ہونا ضروری ہے یعنی مسلمان حکمران ان ساری اسلامی تعلیمات، مطالبات اور تقاضوں پر عمل کریں جن کا مطالبہ شریعت اسلامی کرتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مسلمانوں کو اپنے نظم اجتماعی میں یعنی زندگی کے سارے شعبوں میں (جیسے سیاسی نظام، تعلیمی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) کی تشکیلِ نو کرتے وقت مغربی تہذیب کے نظاموں کو ردّ کرنا ہوگا اور قرآن و سنت، ماضی کے تجربات اور عصری ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی کے ہر شعبے میں نئے نظام وضع کرنا ہوں گے۔ ظاہر ہے یہ کام علماء و فقہاء اور اسلامی سکالرز کے کرنے کا ہے اور مسلم حکمرانوں کا کام انہیں نافذ کرنے کا ہے۔

معاشرے اور ریاست کی اصلاح اور اس میں تبدیلی کے لیے جہاں ضرورت ہو وہاں اجتماعی کوششیں کی جاسکتی ہیں لیکن مغربی طرز کی جماعت سازی، اور وہ بھی مسلکی بنیادوں پر، قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

---

[۱] ’ریاست‘ ایک مغربی تصور ہے اور اس کی تفصیلات خلافِ اسلام ہیں۔ مسلم روایت میں حکومت/ الدولہ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ہم غلط العام ہونے کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کر رہے ہیں۔

مغرب کیوں بالا دست ہے؟

اسلامی نقطۂ نظر سے موضوع پر گفتگو کے بعد ہم بعض لوگوں کے اس اشکال پر کچھ کہنا چاہیں گے جنہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ اگر اسلام اللہ کا سچا دین ہے تو مسلمان آج مغلوب کیوں ہیں اور مغربی تہذیب اگر کفر و جاہلیت پر مبنی ہے تو اس کے علمبردار دنیا میں غالب کیوں ہیں؟ اور دنیاوی زندگی میں وہ مسلمانوں سے کہیں آگے کیوں ہیں؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کے قانونِ زوال وعروج کو سمجھنا چاہیے۔ یہ قانون افراد کے لیے الگ ہے اور قوموں/تہذیبوں کے لیے الگ۔

افراد کے لیے قانون یہ ہے کہ اگر کوئی فرد دنیا کی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر کماحقہ عمل کرے گا تو آخرت میں یقیناً کامیاب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوگا۔ تاہم اگر معاشرہ اور ریاست کفر پر عمل پیرا ہوں، اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کریں تو وہ دنیا میں کامیاب نہیں ہوگا بلکہ اس کی زندگی مشکلات، تکالیف اور باطل سے کشمکش ومزاحمت میں گزرے گی تاہم دنیا میں بھی اسے وہ نعمت ملے گی جو سب سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ ہے اطمینانِ قلب یا سچی خوشی[۱]۔ یاد رہے کہ مغربی معاشرے اور ریاستیں اس وقت اگرچہ دینوی لحاظ سے بظاہر کامیاب، متمدن اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں لیکن وہ اطمینان قلب اور سچی خوشی سے محروم ہیں۔ مثلاً اس وقت امریکی معاشرہ اور ریاست دنیوی لحاظ سے سب سے زیادہ خوش حال، ترقی یافتہ اور کامیاب نظر آتا ہے لیکن دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ جرائم وہاں ہوتے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ خودکشیاں وہاں ہوتی ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض وہاں ہیں اور یہ ساری باتیں اس چیز کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امریکی افراد سب سے زیادہ ناخوش اور غیر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ حقیقی مذہب سے دور ہیں اور اللہ و رسول اور وحی کا انکار کرتے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ و ریاست بھی چونکہ اس وقت، بڑی حد تک، دین پر عمل پیرا نہیں لہٰذا یہاں بھی وہ لوگ جو حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں اور غیر اسلامی رسوم ورواج

---

[۱] اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿28﴾ [الرعد ۱۳:۲۸]

اور قوانین سے موافقت نہیں کرتے وہ مشکلات اور تکالیف کا شکار ہیں تاہم ان میں سے جو کما حقہ دین پر عمل کی کوشش کرتے ہیں وہ اطمینانِ قلب کی نعمت سے بازیاب ہیں۔ افراد، خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، نیک ہوں یا بد، ایک طبعی عمر گزار کر فوت ہو جاتے ہیں۔

ان کی مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں جہاں ان کے دنیاوی اعمال کے مطابق انہیں اچھی یا بری جزا ملے گی۔ یعنی اگر انہوں نے دنیا کی زندگی اللہ کی تعلیمات کے مطابق گزاری ہوگی تو انہیں اللہ کی خوشنودی اور اس کی نعمتیں ملیں گی۔ اور اگر انہوں نے اللہ کی تعلیمات کو ردّ کر کے زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاری ہوگی تو انہیں اللہ کی ناراضی اور اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا (اللہ ہمیں اس سے بچائے)۔

قوموں کے لیے اللہ کا قانونِ عروج و زوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اسلام قبول کرے اور اس پر کما حقہ عمل کرے تو وہی غالب ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس سے سچا وعدہ اور کس کا ہوسکتا ہے؟ فرمایا ﴿اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۳: ۱۳۹] اور فرمایا ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الانبیاء ۲۱: ۱۰۵] اور فرمایا کہ مادی خوشحالی بھی انہی کے لیے ہوگی ﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا﴾ [نوح ۷۱: ۱۱] اس لیے کہ اسلام پر یقین اور پختہ ایمان کی وجہ سے مسلمانوں میں وہ خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جو دنیا میں ترقی اور غلبے کے لیے ضروری ہیں جیسا کہ صدرِ اسلام میں ہوا۔ مسلمان قوم کو زوال صرف اس وقت آئے گا جب وہ اسلام پر کما حقہ عمل چھوڑ دے گی۔ اسلامی تعلیمات پر کما حقہ عمل چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں وہ صلاحیتیں پیدا ہونا بند ہو جائیں گی جو دنیا میں ترقی اور غلبے کے لیے ضروری ہیں۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کا تعلق فرد سے ہے قوم سے نہیں۔ اگر قوم اسلام پر عمل نہ کر رہی ہو تو بھی جو فرد اس پر کما حقہ عمل کر رہا ہوگا وہ دنیا میں اطمینان قلب سے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور اس کی نعمتوں سے بازیاب ہوگا۔

لیکن اگر کوئی مسلم قوم ایسی نہ ہو جو دین پر کما حقہ عمل کر رہی ہو تو پھر اللہ نے ایک وقت مقرر تک دنیا کا نظام تو چلانا ہے، تو جو قوم بھی اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ (گہری وابستگی) رکھتی ہو اس میں وہ بنیادی صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی جو دنیا میں ترقی اور کامیابی کے لیے

ضروری ہیں۔ خواہ اس کا نظامِ حیات اسلام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، یہ قوم تب تک غالب اور کامیاب رہے گی جب تک وہ انسانوں کے لیے نافع رہے گی اور جب تک وہ دنیا کا نظام دوسروں سے بہتر چلانے پر قادر رہے گی لیکن جب وہ نافع ہونے کی بجائے فساد فی الارض میں مبتلا ہوجائے گی اور فساد فی الارض کا غلبہ ہوجائے گا تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو بھی مٹا دیں گے، اقتدار سے ہٹا دیں گے اور دوسری کوئی قوم جو اس سے بہتر، اس سے زیادہ نافع اور نظامِ دنیا چلانے میں اس سے بہتر ہوگی، اللہ اسے موقع دے دے گا۔

اس ’تقریر‘ سے واضح ہے کہ مسلمان آج اس لیے مغلوب ومقہور ہیں کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات پر کما حقہ عمل چھوڑ دیا ہے اور ان میں وہ صلاحیت اور وہ ایمانی واخلاقی قوت باقی نہیں رہی جو دنیا میں غلبے اور کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ وہ قوت ان میں صرف اس وقت واپس آسکتی ہے جب وہ اسلام پر کما حقہ عمل کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجائیں یعنی انفرادی زندگی میں بھی اسلام پر عمل کریں اور اجتماعی زندگی میں بھی، یعنی ان کا معاشرہ اور ریاست بھی اسلامی ہو۔ جب تک وہ یہ نہیں کریں گے وہ مغلوب ومقہور ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری بلا سے کہ امریکہ غالب ہے یا چین اور روس غالب ہوگا۔ ہمیں کیا؟ ہم مسلمان غالب، کامیاب اور طاقتور نہیں ہوسکتے جب تک اسلامی اصول واقدار پر کما حقہ عمل نہ کریں جس کی اساس قرآن حکیم کی رو سے، اسوۂ نبوی کی رو سے اور عقل کی رو[1] سے یہ ہے کہ ہم تعلیم وتزکیہ سے ایسے فرد کی تعمیر کریں جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا خواہاں ہو اور عمل کرے۔ پھر معاشرے کی اصلاح اور ریاست کو مطابقِ اسلام بنانے کے لیے کوششیں، حسب ضرورت، الگ سے بھی کی جاسکتی ہیں لیکن جب

[1] مغرب کی جمہوریت، جو اکثر مسلمان ملکوں میں رائج ہے اور ہمارے ملک میں ’اسلامی جمہوریت‘ کے پردے میں رائج ہے اس میں ’’ایک آدمی ایک ووٹ‘‘ کا اصول چلتا ہے اور ہر آدمی کا حقِ ووٹ برابر ہے۔ لہٰذا حکومت وہی جماعت بناتی ہے جسے زیادہ ووٹروں یعنی عوام کی حمایت حاصل ہو۔ گویا جمہوریت میں اگر اسلامی جماعتیں حصہ لیں تو ان کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ عوام انہیں ووٹ دیں اور عوام آپ کو ووٹ اسی وقت دیں گے جب وہ نفاذِ اسلام میں آپ کے ہم خیال اور حمایتی ہوں۔ بالفاظِ دیگر اگر دینی سیاسی جماعتیں موجودہ جمہوریت کے ذریعے کامیاب ہونا چاہیں تو پھر بھی عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ان کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں تاکہ وہ نفاذِ دین میں ان کے ہم خیال اور حمایتی بن سکیں۔

تک آپ فرد کی تعمیر سیرت و کردار، اسلامی خطوط پر نہیں کریں گے، ان میں آخرت کی فکر پیدا نہیں کریں گے، انہیں اچھا عملی (Practicing) مسلمان نہیں بنائیں گے، نہ وہ دنیا میں کامیاب ہوسکیں گے اور نہ آخرت میں اور ان دونوں میں کامیابی ہی ہمیں بہر قیمت مطلوب ہے۔

ہم یہ باتیں کافی عرصے سے کر رہے ہیں لیکن کوئی ہمیں سن کر نہیں دیتا، نہ حکمران اور نہ دینی طبقے۔ ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو کل سنجیدہ لوگ اس طرف آئیں گے۔ جو آج نہیں سمجھ رہے وہ ٹھوکر کھا کر سمجھیں گے کہ دین اور عقل دونوں کی رو سے اسلام اور مسلم احیاء کا صحیح طریق کار یہی ہے جو ہم عرض کر رہے ہیں۔ اور یہ بات صرف پاکستان کے لیے نہیں ساری امت کے لیے ہے کیونکہ دیگر مسلم ممالک کا حال بھی پاکستان جیسا ہی ہے۔

اس کے لیے ایک اصلاحی تحریک اٹھنی چاہیے۔ جن لوگوں کو اس بات سے اتفاق ہو انہیں چاہیے کہ وہ اس کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں اور ایک تحریک اٹھائیں۔

اے اللہ! لوگوں کے دل ہماری بات کے لیے کھول دے۔ (آمین)

بقیہ: تجدد دیوبندی مزاج کے خلاف ہے

ایک دیوبندی خانوادے کے چشم و چراغ کا اپنے عہد کے تجدد پسند کے ہمرکاب ہونا صف اول کے دیوبندی مزاج کو پسند نہیں آیا۔ یہ چند واقعات اصل دیوبندی مزاج کی تفہیم میں معاون ہوسکتے ہیں۔ اس تفہیم کا حاصل یہ ہے کہ اصل دیوبندی مزاج توسع اور اعتدال و توازن کا نام ہے۔ لیکن وہ اعتدال جو تجدد کی حدوں کو چھو رہا ہو اس کا ہر عہد میں رد کیا گیا ہے۔ اور اگر اس تجدد سے کہیں کچھ مثبت صادر ہوا تو اس کو لینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا گیا۔

موجود عہد میں بھی یہ دیوبندی مزاج اسی سپرٹ کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن کچھ تجدد پسند، کچھ Inclusivity کے احساس کے مارے ہوئے اور کچھ فکری پراگندگی کے شکار احباب کا مطالبہ ہے کہ انہیں اصل دیوبندی مزاج کا نمائندہ ڈکلیئر کیا جائے۔ ان کے مطالبے پر غور کرنے سے قبل ایک لمحے کے لیے غور کرلیں اگر سرسید احمد خان کی مذہبی فکر کو دین کی نمائندہ فکر تسلیم کرلیا جاتا یا آج جاوید احمد صاحب غامدی کی فکر کو دین کی نمائندہ فکر تسلیم کرلیا جائے تو مذہب کا وجود کس قدر زخمی اور چھلنی ہو چکا ہوتا۔

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

فلم عمرو عیار۔ہوش رُبا انکشافات

کیا یہ صحابہ کرام کی اہانت نہیں؟

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فلم پر فوراً پابندی لگائی جائے

آج کل ایک نئی فکشن فلم کے چرچے ہیں جس کا نام عمرو عیار رکھا گیا ہے۔عمرو عیار کا لفظ بولتے ہی ایک چالاک وعیار شخص کا خاکہ ذہن میں اُبھرتا ہے۔یہ کون تھا؟اور کیسے کیسے کام کرتا تھا؟

عام لوگوں اور شاید فلم بنانے والوں کے علم میں بھی نہ ہو کہ پردے کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے؟اس فلم سے متعلق مختلف انٹرویوز میں بس یہ بتایا گیا ہے کہ مغل بادشاہ اکبر کے دور میں کسی داستان گو نے یہ کہانی لکھی تھی۔حالانکہ یہ غلط ہے اور یہ کہانی پہلی دفعہ فورٹ ولیم کالج کے لیے (۱۸۵۵ء میں) لکھنؤ کے خلیل علی اشک نے لکھی تھی۔پھر اس طلسم ہوشربا کی سیریز بڑھتے بڑھتے ۴۶ جلدوں تک پہنچ گئیں۔عمرو عیار اس کہانی کا اہم کردار ہے۔ویسے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے مگر ناقدین کہتے ہیں کہ اگر یہ کہانی فرضی ہوتی تو اس کے تمام کردار بھی فرضی ہوتے جبکہ اس کے کردار فرضی نہیں۔حضرت حمزہؓ عم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور حضرت عمرو بن عاص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ان داستانوں میں Slow Poisoning کے طور پر میں ان دونوں جلیل القدر صحابیوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ اس داستان میں امیر حمزہ سے مراد کوئی اور حمزہ ہے کیونکہ اس داستان کے شروع میں حمزہؓ بن عبدالمطلب لکھا ہے۔

یہ داستان عجب داستان ہے جس میں ادب کم اور بے ادبی در پردہ زیادہ ہے۔امیر حمزہؓ کا نام اس داستان میں تو بس کَوَر (Cover) کے طور پر ہے۔ان کے القاب جو اس داستان میں بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: صاحبِ قِران، شاہ مرداں، مردِ میداں، تاج بخشِ جہاں، امیر کشور گیر جہاں۔کچھ القاب تو اتنے بڑے ہیں کہ وہ صرف خدا کو زیبا ہیں۔

دوسری طرف اس داستان کے کرداروں میں نوشیروان ہے۔ بزرجمہر ہے، تورج ہے، ایرج ہے۔ یہ سب ایرانی ساسانی حکمران رہے ہیں اوران سب کا زمانہ امیرحمزہؓ سے نہیں ملتا۔ داستان امیرحمزہؓ لکھ کر ایرانی آقاؤں کوخوش کرنا اوران کے مذہبی مقاصد کی تکمیل زیادہ لگتاہے۔

۱۔ خلیل علی اشک کے بعد جن لوگوں نے اس میں اضافہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۲۔ محمد حسین جاہ　　۳۔ احمد حسین قمر　　۴۔شیخ تصدق حسین

۵۔سید اسماعیل انز　　۶۔ پیارے مرزا

سید احمد علی وغالب لکھنوی اس کے علاوہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب لکھنو کے روافض تھے۔ان تمام نے اس نام نہاد فکشن میں اپنا اپنا حصہ ڈال کر اپنے آقاؤں سے داد وتحسین وصول کی۔

یہ یادرہے کہ عُمرُو(Umro) درست تلفظ نہیں۔عربی میں اسے عَمْرُ (Amr) پڑھا جاتا ہے۔لہٰذا جب بھی عُمر لکھا جائے تو (Umar) پڑھا جائے گا جبکہ عمر کے ساتھ واؤ لگا ہو تو عمرو کو عَمْرُ (Amr) پڑھا جائے گا جیسے اردو میں قَدْر اور عَصْر پڑھا جاتا ہے۔

اس ساری داستان میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ عُمر کے تلفظ کو جان بوجھ کر بگاڑا گیا ہے اور عُمرو پڑھا جاتا ہے تاکہ حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت عَمروؓ بن عاص جیسے جلیل القدر صحابہ کا مذاق اڑایا جاسکے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ خلیل علی اشک نے عُمرہی لکھا تھا (حوالہ نیچے درج ہے القابات میں)۔

اس داستان میں عمرو عیار کے جو القابات لکھے گئے ہیں وہ خلیل علی اشک نے اپنی کتاب کے جلد چہارم صفحہ ۲ پر یوں بیان کیے ہیں:

سرخیل پاپوش بوساں (جوتیاں چاٹنے والوں کا سردار)، بساط بنی آدم، مولانا معظم، جامع الفضل والکرم، دوندۂ بے درنگ، قلعہ گیر بے جنگ، صاحب قنطورۂ زنگ ، مرداں را سرہنگ، نامرادرا پالہنگ یعنی جنت مآب، شیخ الاصحاب خواجہ عمر۔

ہزبز دشت طراری ونہنگ بحر ذخار عیاری، سرہنگ سرہنگاں بساطِ بلاد بنی آدم، عیار، طرار، مکار، غدار وخنجر گزار (طلسم ہوش ربا، جلد ششم،ص ۹۰۸) ان القابات کا ترجمہ کیا اتنا شرمناک ہے کہ ہم میں اس کا ترجمہ کرنے کی ہمت نہیں۔

داستانِ امیرحمزہؓ میں عمرو بن اُمیہ ضمری کو عمرو عیار سے ملفوف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ عمرو بن اُمیہ ضمری اس حیثیت کا کوئی تاریخی فرد نہیں۔ وہ تو ایک نابینا شخص تھا جو اس کردار کے لائق ہی نہیں تھا۔

بنیادی طور پر اسلامی تاریخ میں جس شخصیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد صاحبِ قران (بہت سعادت مند Very Lucky) کہا جا سکتا ہے وہ سیدنا عمرؓ ہیں جن کے دور میں تمام ایران فتح ہوا۔اس معرکہ میں حضرت عمروؓ بن عاص بھی شامل تھے۔ ۲۲ لاکھ مربع میل تک اسلام پھیل گیا اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ جن کو حضرت عمرؓ بن خطاب سے چڑ رہی وہ ایرانی اور ساسانی حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے داستان امیرحمزہ میں خواجہ عمر لکھا گیا ہے نہ کہ عمرو۔ بعد میں احتیاطاً عمرو کر دیا گیا، مگر یاد رہے کہ دوسری ہستی عمروؓ بن عاص وہ ہیں جنہیں قریش داھیۃ القریش کہتے تھے یعنی قریش کے Genius Person۔ بڑے دانا مدبر اور سمجھ دار۔ اِن کے اسلام لانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ لوگ ''اسلام لاتے ہیں۔ یہ ایمان لائے ہیں''۔آپؓ نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی کھپا دی۔مصر کے گورنر رہے اور اموی دور میں اسلامی فتوحات میں اساسی کلیدی کردار ادا کیا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب ہوں یا حضرت عمروؓ بن عاص دونوں وہ ہستیاں ہیں جنہیں عیار کہنا یا لکھنا کسی طرح قابل برداشت نہیں ہوسکتا لہٰذا اردو ادب سے تعلق رکھنے والے تمام احباب سے ادباً گزارش ہے کہ غور کریں کہ مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنے ہیروز کی کردار کشی کس طرح ادب کی خدمت کہلا سکتی ہے؟ کیا اس طرح سے یہ بے ادبی ادب کے راستے ہمیں خدا اور سول کا بے ادب نہ بنا دے گی؟ کیا یہ حرکت شنیعہ ہمیں (Blasphemy) کے لیے تیار تو نہیں کر رہی؟ بہت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ دیگر اہل علم بھی اس موضوع پر سوچیں اور لکھیں تاکہ نوجوان نسل گمراہی سے بچ سکے بلکہ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس فلم پر فوراً

پابندی لگائی جائے اور اہل علم ولغت 'عمروعیار' کے الفاظ کا استعمال بند کر دیں۔

آج ذہن سازی کے لیے فلموں اور ڈراموں سے بہتر میڈیم کیا ہوسکتا ہے؟ عیاری اور مکاری کو اسلام میں کبھی بھی اچھا نہیں سمجھا گیا چہ جائیکہ اس کی نسبت جلیل القدر صحابہ رسول سے کی جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن دوزبانوں والا نہیں ہوتا (الحدیث)۔ مومن بدعہد نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اسلام کا چہرہ ہے بلکہ یہ تو کھلی اسلام دشمنی ہے۔

بقیہ: محکوم قوم کی نشانیاں

جب ریاستیں برباد ہوتی ہیں، تو ہر سو دہشت پھیلتی ہے اور لوگ گروہوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ عجائبات ظاہر ہوتے ہیں اور افواہیں پھیلتی ہیں۔ بانجھ بحثیں طول پکڑتی ہیں۔ دوست دشمن اور دشمن دوست میں بدل جاتا ہے۔ باطل کی آواز بلند ہوتی ہے اور حق کی آواز دب جاتی ہے۔ مشکوک چہرے زیادہ نظر آتے ہیں اور ملنسار چہرے سطح سے غائب ہو جاتے ہیں۔ حوصلہ افزا خواب نایاب ہوجاتے ہیں اور امیدیں دم توڑ جاتی ہیں۔ عقلمند کی بیگانگی بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں کی ذاتی شناخت ختم ہوجاتی ہے اور جماعت، گروہ یا فرقہ ان کی پہچان بن جاتے ہیں۔

مبلغین کے شورشرابے میں دانشوروں کی آواز گم ہوجاتی ہے۔ بازاروں میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور وابستگی کی بولیاں لگ جاتی ہیں۔ قوم پرستی، حب الوطنی، عقیدہ اور مذہب کی بنیادی باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی خاندان کے لوگ خونی رشتہ داروں پر غداری کے الزامات لگاتے ہیں۔

بالآخر حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ لوگوں کے پاس نجات کا ایک ہی منصوبہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے ''ہجرت''۔ ہر کوئی ان حالات سے فرار اختیار کرنے کی باتیں کرتا ہے۔ تارکین وطن کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ وطن ایک سرائے میں بدل جاتا ہے۔ لوگوں کا کل سازوسامان سفری تھیلوں تک سمٹ آتا ہے۔ چراگاہیں ویران ہونے لگتی ہیں، وطن یادوں میں اور یادیں کہانیوں میں بدل جاتی ہیں۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر مفتی یاسر ندیم الواجدی [1]

مدرسہ ڈسکورسز

بھارت کے علماء کرام و دینی مدارس ہوشیار ہو جائیں

آج ہی ایک اشتہار دیکھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف ریلیجس اینڈ سوشل تھاٹ کے اشتراک سے مدرسہ ڈسکورسز انڈیا کا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔ اس طرح کے پروگرام دن رات منعقد ہوتے ہیں لیکن جو چیز قابل توجہ تھی، وہ مہمان ذی وقار کا نام تھا: پروفیسر ابراہیم موسیٰ، کلیدی خطاب کے طور پر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا نام بھی درج تھا۔

مَیں کل ہی یہ سوچ رہا تھا کہ پاکستان میں غامدی فکر کے ترجمان عمار خان ناصر کے زیر انتظام مدرسہ ڈسکورسز نے اپنے وجود کا احساس دلا کر ابھی تک انڈیا کا رخ کیوں نہیں کیا؟ لیکن افسوس کہ چند گھنٹوں میں ہی یہ انکشاف ہو گیا کہ انڈیا کا نہ صرف یہ کہ رخ ہو چکا ہے بلکہ پروگرام کے تئیں مذہبی حلقوں میں اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی علمی شخصیت کو دعوت بھی دے دی گئی ہے۔

مدرسہ ڈسکورسز آخر ہے کیا؟ اس کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس پروگرام کے پیچھے کون سا ادارہ ہے؟ امریکہ کی سب سی بڑی کیتھولک یونیورسٹی نوٹر ڈیم جو امریکی صوبے انڈیانا میں واقع ہے دراصل اس پروگرام کی محرک ہے۔ اس یونیورسٹی کے ایک ذیلی ادارے کے پروفیسر ابراہیم موسیٰ جو اصلاً جنوبی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں مدرسہ ڈسکورسز کے ذمے دار بنائے گئے ہیں۔ اس پروگرام کے دوسرے ذمے دار ہیں پروفیسر ماہان مرزا۔ ان دونوں شخصیات کے نظریات پر کچھ کہنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مدرسہ ڈسکورسز نامی اس پروگرام کا مقصد کیا ہے؟ نوٹر ڈیم یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر اس پروگرام کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ: اس پروگرام کا مقصد علماء کو پلورلزم، جدید سائنس، اور جدید فلسفہ سے آراستہ کرنا ہے۔

---

[1] بھارتی مسلم سکالر مقیم شیکاگو

پلورلزم ایک جدید اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے: یہ نظریہ رکھنا کہ میرا مذہب ہی سچائی کا مصدر نہیں ہے، بلکہ حق دیگر مذاہب میں بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح یہ نظریہ رکھنا کہ مختلف مذاہب ایک عالمگیر سچائی کی الگ الگ تعبیرات ہیں۔ گویا اسلام کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے بلکہ مسیحی اور یہودی مذاہب بھی درست ہیں کیوں کہ وہ حقانیت ہی کی دوسری تشریح ہیں۔ اس نظریے کو جدید ترین اصطلاح میں پرینیلزم بھی کہا جاتا ہے۔ لہذا مدرسہ ڈسکورسز میں فضلائے مدارس کو داخل کر کے یہ تربیت دی جائے گی کہ پلورلزم پر کیسے ایمان لایا جاسکتا ہے اور کیسے یہ جاہلی نظریہ آج کے دور میں ضروری ہے۔

اس پروگرام کے ذمے داران نے اپنی فیس بک پروفائل پر چند تصاویر نشر کی ہیں۔ سترہ جون کی پوسٹ میں ماہان مرزا ان تصاویر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مدرسہ پروجیکٹ پر ایک سیمینار کی میزبانی پر خوش ہوں۔ سیمینار میں اس میدان کے عظیم اسکالرز نے ابراہیم موسی کی سرپرستی میں شرکت کی۔ اب ذرا اس مختصر سے سیمینار میں شریک دو تین شخصیات کے حالات ملاحظہ کیجیے تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ ایک عیسائی یونیورسٹی کو ہمارے مدارس کے فضلاء کے مستقبل کی فکر کیوں ہے؟

۱۔ محمد فضل۔ یہ صاحب ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور شریعت میں ہم جنس پرستوں کے نکاح کے لیے گنجائش تلاش کرنے کے حوالے سے امریکی مسلم حلقوں میں مشہور ہیں۔

۲۔ سعدیہ یعقوب۔ یہ محترمہ "فتنہ" نامی مسلم فیمنسٹ گروپ کی شریک بانی ہیں۔ اس گروپ کا فیس بک پیج بھی ہے جس پر وقتاً فوقتاً علماء اور مذہبی حلقوں کو شدید نشانہ بنایا جاتا ہے، یہ گروہ اسلام کی نسوانیت پسند تشریح کے لیے مشہور ہے۔

۳۔ ماہان مرزا خود بھی 'پروگریسیو مسلم یونین' نامی تنظیم میں شامل ہیں۔ اس تنظیم کے وکی پیڈیا پیج پر صاف لکھا ہے کہ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ مساجد میں خواتین کی امامت میں اقتدا درست ہے۔ ۲۰۰۵ء میں امینہ ودود نے ایک چرچ میں جمعہ کی امامت کر کے پوری دنیا کے اخبارات کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ تنظیم امینہ ودود کی علی الاعلان حمایت کرتی ہے۔ اس تنظیم کے بانی کا نام ہے امید صفی۔

ماہان مرزا اور امید صفی زیتونہ کالج کے مجلّے "رینویٹیو" کے ادارتی بورڈ میں شامل ہیں۔ رینویٹیو لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تجدید کے ہیں۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ نوٹرڈیم نے مدرسہ ڈسکورسز والے پیج پر تجدید نامی ایک اردو مجلّے کا لنک بھی دیا ہوا ہے جو یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوتا ہے اور اس کی ادارت انڈیا کے ڈاکٹر وارث مظہری انجام دیتے ہیں۔ معاون ایڈیٹر کے طور پر عمار خان ناصر کا نام ہے جو اس وقت غامدی فکر کے بڑے ترجمان ہیں اور المورد پاکستان کے ذمے داران میں سے ایک ہیں۔

ماہان مرزا جس زیتونہ کالج سے وابستہ ہیں اس کے ذمے دار حمزہ یوسف ایک مشہور مقرر ہیں، لیکن اپنی زندگی کے مختلف اور متضاد اطوار کے لیے جانے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ٹرمپ انتظامیہ کے مشیر کی حیثیت سے ان کا تقرر رہا ہے۔ ان کے استاذ عبداللہ بن بیہ ایک مشہور علمی شخصیت ہیں۔ ان کی سرپرستی میں چند ماہ پہلے دبئی میں پلورلزم کے عنوان کے تحت حکومت کے ایماء پر عالمی کانفرنس ہوئی۔ مدرسہ ڈسکورسز کے ڈائریکٹر ابراہیم موسیٰ دبئی کانفرنس کے مداحین میں شامل ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ بن بیہ کی موجودگی میں پوپ نے مراکش کا دورہ کیا اور اس کے سامنے اذان اور چرچ کا گانا دونوں ایک ساتھ پڑھے گئے۔ یوٹیوب پر اس کی ویڈیو موجود ہے۔ حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم عالیہ نے اپنے ٹویٹر ہینڈل کے ذریعے اس فکر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

چند روز قبل مدرسہ ڈسکورسز پاکستان کے تحت منعقد ہونے والے پروگرام کی روداد بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ اس پروگرام میں شامل چند مقررین نے جس طرح اپنی فکر کا اظہار کیا اس کے بعد اس گروہ کے عزائم جاننے کے لیے کسی گہری تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سب تفصیلات اس لیے درج کی ہیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ مدرسہ ڈسکورسز کے نام پر علماء کو بھرتی کر کے انھیں کس طرح ڈھالے جانے اور پھر استعمال کرنے کی کوششوں کا آغاز پاکستان کے بعد انڈیا میں ہونے جا رہا ہے اور مغرب کیسے اس جاہلی فکر کو مختلف طریقوں سے اسلامی مشرق پر مسلط کر رہا ہے۔ یہ واضح رہے کہ سعودی اسکولوں میں نصابِ تعلیم واشنگٹن سے

تیار ہو رہا ہے لیکن یہ جبر انڈیا اور پاکستان میں ممکن نہیں ہے، اس لیے یہ طاقتیں حکمتِ عملی بدل کر مدارس سے وابستہ مذہبی حلقوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ہمارے علمائے کرام ہو سکتا ہے کہ ان عزائم سے ناواقف ہوں۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہونے والے اس پروگرام سے پہلے علمائے کرام کو حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔ امید ہے کہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم العالیہ اور ان جیسی دیگر معتبر شخصیات کا نام ایسے واضح فتنوں کے لیے استعمال نہیں ہوگا۔

تعلیم و تربیت — مدیر

تعلیم و تربیت اور دینی عناصر کی غفلت

پنجاب کی غریب حکومت کے پاس سکول چلانے کے لیے پیسے نہیں
وہ سکول پرائیویٹ سیکٹر کی NGOs کو دے رہی ہے

تعلیم کو اہمیت نہ دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ن لیگ کی مرکزی حکومت نے جی ڈی پی کا صرف 1.5 فیصد تعلیم کے لیے وقف کیا ہے۔ ادھر پنجاب کی حکومت اتنی غریب ہے اور تعلیم اس کی نظر میں اتنی غیر اہم ہے کہ اس نے سکول پرائیویٹ سیکٹر کی NGOs کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ ان NGOs میں سے اکثر وہ ہیں جو غیر ملکی امداد سے چلتی ہیں اور ان کے پیش نظر لبرل اور سیکولر ایجنڈا ہوتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دینی جماعتیں خوابِ استراحت میں ہیں۔ اس حکومتی روش کے خلاف نہ کسی کا کوئی مذمتی بیان آیا ہے اور نہ وہ خود سکولوں کو اسلامی اصولوں پر چلانے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ ﴿فَاعۡتَبِرُوۡا يٰۤاُولِى الۡاَبۡصَارِ﴾

تعلیم و تربیت ادارہ

پاکستان میں تعلیم

تازہ اعداد و شمار۔ بجٹ 2024ء [1]

تعلیمی بجٹ 2024ء			69.7 بلین
پچھلے سال خرچ کیا گیا بجٹ 2023ء میں			47.1 بلین
تعلیمی بجٹ		جی ڈی پی کا	1.5 فیصد
شرح خواندگی			62.8 فیصد
مردانہ	73.4 فیصد	زنانہ	62.8 فیصد
شہری آبادی			77.3 فیصد
دیہی آبادی			54.0 فیصد
یونیورسٹیوں کی تعداد			263
پبلک سیکٹر	154	پرائیویٹ سیکٹر	109
پی ایچ ڈی فیکلٹی			35.40 فیصد
بچے جو سکول نہیں جا رہے			32 فیصد
طلبہ	27 فیصد	طالبات	37 فیصد

ایریا وائز

پنجاب	24 فیصد	PK خیبر	32 فیصد
سندھ	44 فیصد	بلوچستان	47 فیصد

[1] ماخذ اکنامک سروے آف پاکستان 2024ء

تفہیم دین

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

جائز اختلاف اور گمراہی میں فرق

ان سکالرز اور علماء کے لیے جو جاوید غامدی اور عمار ناصر کو گمراہ نہیں سمجھتے

مدیر البرہان کی ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری [۱] سے برقی مراسلت

ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری

ایک دائرہ ہے امت مسلمہ کا؛ اِس میں ہر وہ شخص آتا ہے جو توحید باری کا اقرار کرتا؛ ختم نبوت پر ایمان رکھتا اور ضروریاتِ دین یعنی اسلام کے اجماعی، اتفاقی اور قطعی امور کو تسلیم کرتا ہے؛ یہ مسلمان ہے۔

اس کے بعد مسلکی دائرے آتے ہیں جن کی بنیاد ائمۂ مجتہدین کی تشریحات ہیں؛ ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ ان میں سے جسے قرینِ صحت سمجھے، اس سے وابستگی رکھے؛ اپنے نقطۂ نظر کی ترجیح کو دلائل سے ثابت کرے اور دوسروں کے موقف پر شائستگی سے نقد کرے۔

اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ان مکاتب میں باہمی مکالمہ جاری رہنا چاہیے لیکن اس سے کوئی امت کے دائرے سے نکلتا ہے، نہ بحیثیت مسلمان اس کے حقوق ساقط ہوتے ہیں۔ آج ہمیں اپنے تمام تر مسلکی اختلافات کے باوصف امت کی سطح پر متحد ہونے کی ضرورت ہے کہ یہی وقت کا تقاضا ہے۔

مدیر البرہان

قبلہ ڈاکٹر صاحب! اس معاملے کی وضاحت فرما کر رہنمائی فرمائیں۔

مسلکی اختلاف یعنی جائز اختلاف کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور گمراہی کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ظاہر ہے جب آپ عالمِ دین ہیں اور کسی کو گمراہ سمجھتے ہیں تو اس کے ساتھ اتحاد کی بجائے لوگوں کو اس کے شر سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی سے

---

[۱] ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال یونیورسٹی کی فیکلٹی علوم اسلامیہ وعربیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور سلفی الفکر ہیں

آمین بالجہر پر اختلاف ہے تو یہ مسلکی اختلاف ہے، اس سے درگزر کرنا چاہیے لیکن غلام احمد پرویز سے آپ کا اختلاف مسلکی ہے بلکہ اصولی ہے اور آپ اسے گمراہ سمجھتے ہیں تو اس سے سمجھوتا، رواداری، یکجہتی اور اتحاد بین المسالک کیسے ممکن ہے؟

اب یہ دیکھیے کہ پاکستان کے سارے دینی مسالک کے جمہور علماء کرام اس پر متفق ہیں کہ جاوید غامدی اور ان کے ہم خیال متجدد ہیں اور گمراہ ہیں۔ خود ملی مجلس شرعی جس کے صدر آج کل عمار ناصر صاحب کے والد مولانا زاہد الراشدی صاحب ہیں، ان کی موجودگی میں جاوید غامدی صاحب کا مسئلہ مجلس میں پیش ہوا اور سارے مسالک کے علماء کرام (جن میں حافظ عبدالغفار روپڑی اور حافظ ڈاکٹر حسن مدنی بھی موجود تھے) نے غامدی صاحب کو اور ان کے ہم نواؤں کو گمراہ قرار دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کا مؤقف کیا ہے؟ اور غامدی صاحب اور عمار ناصر صاحب کی فکر کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ یاد رہے کہ غامدی صاحب سے علماء کرام کا بنیادی اختلاف وہی پرویز والا ہے یعنی انکار و استخفاف سنت اور تجدد یعنی دین کی تشریح مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی روشنی میں کرنا۔

ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری

مجھے جاوید احمد صاحب غامدی کی فکر سے ہرگز اتفاق نہیں ہے؛ جناب عمار خان ناصر صاحب بھی، جزوی اختلافات سے قطع نظر، اصولی طور پر غامدی صاحب ہی کی فکر کے حامل ہیں۔

میری گزارش صرف اتنی ہے کہ ان صاحبان کے نظریات سے بھرپور اختلاف رکھتے ہوئے اور اس کی علمی تنقید کرتے ہوئے بھی سماجی سطح پر ان سے تعامل ہوسکتا ہے اور احترام کا رشتہ برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

ان کا موقف حدیث وسنت کے متعلق واقعتاً جمہور اہلِ اسلام اور خصوصاً اہلِ سنت سے جداگانہ ہے مگر اسے پرویز کے مانند قرار دینے میں مجھے سخت تامل ہے۔

جہاں تک عدالت میں رائے پیش کرنے کا تعلق ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ ہمیں اختلافی آرا سے گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور ویسے بھی عدالتی فورم پر نہ سہی دیگر پبلک فورمز پر تو وہ رائے پیش ہو ہی جائے گی تو پھر خواہ مخواہ دبانے سے کیا حاصل؟!

المختصر یہ کہ غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ کے افکار اہل سنت والجماعت کے فکری منہاج سے جداگانہ ہیں مگر ان سے سماجی تعامل روا ہے اور رہنا چاہیے۔

مدیر البرہان

قبلہ ڈاکٹر صاحب!

آپ نے میرے جواب سے امالہ اختیار فرمایا۔ دوبارہ عرض ہے کہ میں آپ سے یہ درخواست کرر ہا ہوں کہ: جمہور علماء اہل سنت واہلحدیث جاوید غامدی اور ان کے ہم نواؤں کو انکار واستخفافِ سنت اور تجدد (اسلام کی تشریح مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے مطابق کرنا) کی وجہ سے گمراہ سمجھتے ہیں۔ کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں؟ ہاں یا نہ میں جواب عنایت فرمایئے۔

چیف جسٹس صاحب کی عدالت میں یہی ہوا کہ سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام (بشمول جماعت اسلامی) نے کہا کہ وہ عمار ناصر کو دین کا صحیح نمائندہ نہیں سمجھتے۔ یہ متنازعہ شخص ہے، یہ دین کا صحیح نمائندہ نہیں ہے۔ ہم اسے نہیں سننا چاہتے۔ اس سے تو ہمارے مندرجہ بالا مؤقف کی تصدیق ہوگئی کہ جمہور علماء کرام غامدی اور عمار ناصر کو گمراہ سمجھتے ہیں۔

جہاں تک سماجی تعلقات کا معاملہ ہے تو آپ اگر گمراہوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ گپ شپ کرنا اور کھانا پینا رکھنا چاہتے ہیں تو کیجیے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ "كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ" اور اس کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ "المرء علی دین خلیله فلینظر أحد کم من يُخَالِل" اور فرمایا کہ جو جس سے محبت کرتا ہے وہ آخرت میں اسی کے ساتھ اٹھے گا اور سائل سے فرمایا "انتَ مع من احببتَ"

باقی آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری

اصولی گزارشات تو عرض کر دی تھیں، آپ معیّن اطلاق کی بات فرما رہے ہیں جو میری دانست میں فی الوقت اور کم از کم اس فورم پر ضروری نہیں ہے۔ آپ نے آخر میں جو المرء علی دین خلیله اور انت مع من احببت کی بات فرمائی تو یہ قلبی معاملات ہیں اور سماجی

تعامل کے معنی خلت کے نہیں ہیں۔

بہر حال اب اس بات کو طول دینے کا فائدہ نہیں ہے۔ آپ بھی میرے لیے لائق احترام ہیں اور عمار صاحب بھی۔ مجھے دینی مسائل پر جمہور اہل سنت ہی کی تعبیرات سے اتفاق ہے مگر تعامل کے باب میں موجودہ روایتی مسلکی اپروچ بہت کچھ افراط و تفریط کا شکار ہے۔ آج بھی دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ کے دارالافتاء ایک دوسرے کی کلّی تضلیل و تفسیق اور گاہے تکفیر تک کے فتاویٰ ہی صادر کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں تو اہل المورد ہی کو کیوں اچھوت بنا دیا جائے؟ ایک حنفی مقلد اصولی طور پر غیر مقلد اہل حدیث کو بدعتی اور گم راہ سمجھتا ہے۔ بریلوی مفتی دیوبندی اور اہلِ حدیث کو گستاخ اور بدمذہب قرار دیتا ہے۔ یہ سبھی شیعوں کو دائرہ اسلام سے قریباً باہر ہی گردانتے ہیں اور شیعہ بھی ان کو مومن ماننے کو تیار نہیں۔ اس کے باوصف اگر یہ باہم مل کر ملی مجلس شرعی بنا سکتے ہیں تو خاکسار اپنے اختلافی موقف کا اظہار کرتے ہوئے اصحابِ غامدی سے سماجی تعلقات کیوں نہیں رکھ سکتا؟

آخر یہ گمراہوں سے میل جول والا اصول صرف غامدی صاحب اور ان کے تلامذہ ہی پر کیوں لاگو کیا جاتا ہے اور باقی گمراہوں سے مل کر ملی مجلس شرعی بنالی جاتی ہے؟ یہ عقدہ اگر حل ہو سکے تو عین نوازش ہوگی۔

باقی احقر کو ان احباب سے جو اختلافات ہیں، ان کو کبھی چھپایا نہیں اور موقع کی مناسبت سے ہمیشہ پبلک فورمز پر بیان بھی کیا ہے کہ نظری اور اصولی پوزیشن میں کامل درجہ استواری درکار ہے جب کہ سماجی تعامل میں ہر ممکن لچک ہی شرع کا مطلوب ہے۔

البرہان

چونکہ ڈاکٹر عسکری صاحب بات کو طول دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے ہم نے انہیں اس میسج کا جواب نہیں دیا۔ البتہ ہم یہ معاملہ اب چونکہ قارئین البرہان کے سامنے رکھ رہے ہیں تو چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

* قارئین نے نوٹ فرمایا ہوگا کہ ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری صاحب نے میرے اصرار کے باوجود غامدی اور عمار ناصر کو گمراہ کہنے سے ابا کیا ہے اور ان سے تعلقات رکھنے پر مصر ہیں

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح مَیں ان کے لیے قابل احترام ہوں[۱] اسی طرح عمار ناصر بھی ان کے لیے قابل احترام ہیں۔ گویا ڈاکٹر امین اور ڈاکٹر عمار ناصر ان کے لیے برابر ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ عمار ناصر کو گمراہ نہیں سمجھتے بلکہ امت سے ان کے اختلاف کو جائز علمی اختلاف سمجھتے ہیں جس طرح کہ مختلف فقہی وکلامی مسالک جیسے مثلاً احناف اور شوافع میں ہے۔

دراصل یہی معاملہ ہے جو ہم نے ان کے ساتھ اٹھایا تھا کہ غامدی صاحب اور ان کے ہم نواء کہتے ہیں کہ وہ جو پیش کر رہے ہیں وہ صحیح اسلام ہے، وہ عین اسلام ہے اور جمہور علماء سے ان کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسا علماء میں مسلکی اختلاف ہوتا ہے۔ ہم اس کی نفی کرنا چاہتے تھے اور اب بھی کرنا چاہتے ہیں۔ بحث کو مختصر رکھنے کی خاطر ہم نے صرف انکار و استخفافِ سنت اور پرویز کی مثال دی اور کہا کہ یہ جمہور علماء اہل سنت و اہل حدیث کا مؤقف ہے کہ وہ پرویز اور غامدی کو انکار و استخفافِ سنت کی وجہ سے گمراہ سمجھتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ غامدی کے انکار و استخفافِ سنت کو پرویز جیسا نہیں سمجھتے۔ یہاں ان کی رائے جمہور علماء اہل سنت و اہل حدیث سے مختلف ہے اور ان کا تفرد ہے۔ تاہم اگر دونوں میں انیس بیس کا فرق ہو بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

* ہم اس پر پہلے بھی زور دیتے رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ جائز اختلاف کی حدود کیا ہیں؟ اور کہاں جائز اختلاف کی ریڈ لائن عبور ہو جاتی ہے اور اختلاف گمراہی میں بدل جاتا ہے۔ جائز اختلاف کے ہم بھی قائل ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں اور اختلاف رائے کے باوجود ذاتی احترام اور تعلقات میں فرق نہیں آنے دیتے اور اس کی تردید بھی ضروری اور اہم نہیں سمجھتے۔ لیکن جب اختلاف گمراہی کی حدود کو چھونے لگے اور متعلقہ صاحب اپنی گمراہی تسلیم بھی نہ کریں بلکہ اپنی رائے کو صحیح اور جمہور علماء کی رائے کو غلط قرار دیں تو پھر ہم اس کی تردید ضروری سمجھتے ہیں تاکہ عوام کو اس گمراہ شخص کی پیروی سے بچایا جائے اور ان کے دین کی حفاظت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہم نے غامدی صاحب کی گمراہی کو سمجھا ہے ہم مسلمان عوام کو حتی الامکان ان کی گمراہی سے بچنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ

---

[۱] یہ ان کی محبت اور وضع داری ہے جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

جاوید غامدی صاحب سے ہماری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں بلکہ محض ان کے غلط نظریات ہیں۔

جاوید غامدی صاحب سے میرے تعلقات ۱۹۸۷ء میں بہت اچھے تھے۔ ہوا یہ کہ جب میں اپریل ۱۹۸۶ء میں سعودی عرب سے واپس آیا تو جماعت اسلامی کی فکر سے اختلاف اور مایوسی کی وجہ سے کسی متبادل دینی پلیٹ فارم کی تلاش میں تھا تو میں نے کئی جگہوں کو آزمانے کی کوشش کی۔ اہل حدیث بھائیوں، تحریک اسلامی (نعیم صدیقی والی) اور جاوید غامدی صاحب (جن کا تجدد اس وقت بہت واضح نہیں تھا) کے ساتھ تھوڑی دیر چل کر دیکھا لیکن کہیں بات نہ بنی۔ ۱۹۸۷ء میں مَیں نے اور جاوید صاحب نے مل کر ایک دعوتی جماعت 'انصار المسلمین' بنائی لیکن ایک سال بعد ہی جب مَیں ان کی فکر سے اوبھ گیا اور اس سے کنارہ کشی کر لی تو انہوں نے 'انصار المسلمین' کو ختم کر دیا۔ میرا ان سے اختلاف سنت ہی کے مسئلے پر ہوا اور ۱۹۸۷ء کی ایک فجر کے بعد میری اور ان کی خصوصی نشست سنت کے مسئلہ پر ان کے ماڈل ٹاؤن کے ای بلاک والے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہوئی اور اس کے بعد مَیں کبھی لوٹ کر ان کے پاس نہیں گیا۔ مَیں نے ہمیشہ انہیں بااخلاق، صاحبِ علم اور وضع دار انسان پایا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری کہیں ملاقات ہو جائے تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے پیش آئیں گے، اکٹھے بیٹھ کر چائے پئیں گے اور پھر اجازت لیں گے۔ یہ ہوتے ہیں سماجی تعلقات۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر مَیں ان کے نظریات کو غلط اور امت کے لیے نقصان دہ سمجھوں تو ان کی تردید نہ کروں۔ مَیں یہ تردید ضرور کروں گا اور مسلمانوں کو ان کے گمراہ کن خیالات سے بچانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ تمام امت کے علماء کو غلط کہہ سکتے ہیں تو مجھے دلائل کے ساتھ ان کو غلط کہنے میں کیوں ہچکچاہٹ ہو؟

ڈاکٹر عسکری صاحب کو یہ سمجھنے میں اشکال ہوا ہے کہ پھر مَیں نے مختلف مسالک کے علماء کرام سے مل کر ایک مشترکہ علمی پلیٹ فارم 'ملی مجلس شرعی' کے نام سے کیوں بنا رکھا ہے؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ملی مجلس شرعی میں ابتداء میں صرف اہل سنت علماء شامل تھے (یعنی دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے)۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے جو اس کے اساسی رکن ہیں، یہ رائے دی کہ قومی مسائل ومعاملات میں (اختلافی دینی مسائل میں نہیں) اہل تشیع کو بھی بلا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں جسے دیگر علماء کرام نے قبول کر لیا۔

یہ مجلس بنانے سے ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ مختلف مسالک کے علماء جب اکٹھے بیٹھیں گے تو اکٹھے بیٹھ کر چائے پئیں گے، کھانا کھائیں گے، اکٹھے نماز پڑھیں گے، تبادلۂ خیال کریں گے تو ان میں باہمی محبت بڑھے گی، کدورتیں کم ہوں گی، یکجہتی کو فروغ ملے گا وغیرہ۔ الحمدللہ یہ مقصد حاصل ہوا۔

بلاشبہ ہم قومی مسائل میں اہل تشیع کو بھی بلا لیتے ہیں لیکن غامدی صاحب کے کسی آدمی کو نہیں بلاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل تشیع سے اہل سنت کا اختلاف واضح اور معلوم ومعروف ہے۔ وہ ہمارے ہاں کبھی زیر بحث بھی نہیں آیا۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب کہیں کہ وہ قادیانی ہیں یا پرویزی ہیں تو بھی شاید مَیں ان کی تردید میں زور نہ لگاؤں کیونکہ امت تسلیم کرتی ہے کہ قادیانی کافر ہیں اور امت جانتی ہے کہ پرویزی منکرین سنت اور گمراہ ہیں۔ لیکن کئی دینی مدارس کے صاحبزادگان (جیسے جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مفتی محمد زاہد صاحب اور کراچی والے سید عزیز الرحمن صاحب) اور علوم اسلامیہ کے کئی پروفیسرز بشمول ڈاکٹر طاہر عسکری صاحب اوران کے علاوہ بہت سے مغرب زدہ مسلمان جو دین کا مکمل علم نہیں رکھتے، یہ تسلیم نہیں کرتے کہ غامدی صاحب، عمار ناصر صاحب اوران کے ہم نوا متجدد ہیں، انکار واستخفافِ سنت کے مرتکب ہیں اور گمراہ ہیں لہٰذا ان کی گمراہی پر جو پردہ پڑا ہوا ہے، تمام مصلحتوں سے بالاتر ہو کر ہم اسے چاک کرنا چاہتے ہیں اور حق وباطل کے التباس کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جب وہ اہل تشیع اور پرویزیوں کی طرح معروف ہو جائیں گے اور امت جان اور مان لے گی کہ غامدی اوران کے ہمنوا بھی پرویزیوں کی طرح منکرینِ سنت اور گمراہ ہیں تو پھر ہم بھی ان کے بارے میں تردیدی رویہ نرم کرلیں گے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ مسلم زوال کے بعد اس وقت سب سے بڑا چیلنج جو امت مسلمہ کو درپیش ہے وہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کا ہے۔ مغربی فکر وتہذب کا غلبہ اوراس تہذیب کے علمبردار امریکہ ویورپ اوراس کے ہم نواؤں کی اسلام اور مسلم دشمنی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے میں وہ 'مسلمان اہل علم' جو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے علمی ،فکری اور عملی غلبے سے مرعوب ہوکر اسلام کی ایسی تشریح کرنے پر تل جائیں جو مغرب کو پسند ہو، جو ساڑھے چودہ سو سال کے جمہور اہل علم اور جمہور امت کی روایات کے خلاف ہو، جو اجماع کو ردّ کریں، جو سنت

کا انکار و استخفاف مستشرقین کے تتبع میں اس لیے کریں کہ قرآن کی من مانی تشریح کی جا سکے بلکہ یہ کہہ کر وہ پورے دین کی نئی تعبیر کریں کہ پچھلے علماء وفقہاء بات کو سمجھے نہیں اور صحیح دین وہ ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ ایسے 'اہل علم' اس قابل ہیں کہ ان کو مردود قرار دیا جائے اور ایک ایک مسلمان کو بتایا جائے کہ دین کے ان رہزنوں سے بچو۔ یہ کام ماضی میں معتزلہ کے مقابلے میں امام ابن حنبلؒ، امام اشعریؒ، امام غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ نے کیا تھا اور ہم انہی اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جدید معتزلہ کو ردّ کر رہے ہیں۔ اس میں اگر ڈاکٹر عسکری صاحب اپنا وزن ان جدید معتزلہ کے ساتھ ڈالنا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ آدمی وقت کے ساتھ ساتھ پرانے روگوں اور دردوں کا عادی ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ گزارہ کرنے کا اور ان کے ہوتے ہوئے زندگی گزارنے کی اسے عادت ہو جاتی ہے لیکن جب کوئی نیا درد شروع ہو تو نفسیاتی طور پر آدمی زیادہ درد محسوس کرتا ہے اور اس کا علاج کرنے کی کوشش کرتا اور اس سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اہل تشیع کی گمراہی پر صدیاں گزر گئیں لہٰذا ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ مغربی فکر و تہذیب کی نقالی میں اسلام کا حلیہ بگاڑنے والے جاوید غامدی اور عمار ناصر صاحب کی گمراہی کی چبھن ابھی تازہ ہے اس لیے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

یہ ساری باتیں ہم نے اس لیے کیں کہ ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری صاحب اور اُن کے اِن ہم نواؤں کو جو غامدی اور عمار ناصر صاحب کے ساتھ اختلاف کو جائز علمی اختلاف سمجھتے ہیں، اپنا نقطۂ نظر سمجھا سکیں کہ ہم جاوید غامدی اور عمار ناصر صاحب کے تجدد کو کیوں گمراہی سمجھتے ہیں، برداشت نہیں کرتے اور کیوں ان کی تردید پر تُلے ہوئے ہیں۔ اللہ کرے ہمیں اس میں کچھ کامیابی ہوئی ہو۔

جہاں تک مسلکی علماء کا باہم تکفیر و تفسیق کا معاملہ ہے تو ہم نہ صرف اسے غلط سمجھتے ہیں بلکہ عرصے سے اس رجحان کو کم اور ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔

﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾

تفہیم دین

محمد عرفان ندیم

تجدد دیوبندی مزاج کے خلاف ہے

تجدد کے باب میں دیوبندی مزاج کیا ہے؟ یہ بحث وقتاً فوقتاً سوشل میڈیا پر جاری رہتی ہے۔ میں نے "دیوبندی مزاج" کی تعبیر تفہیم کے لیے لکھی ہے ورنہ اصل تعبیر یہ ہونی چاہیے کہ اہل روایت کا مزاج کیا ہے؟ اس بحث کا پس منظر یہ ہے کہ بعض تجدد پسند یہ خلط مبحث پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ عہد کا دیوبندی مزاج اسلاف کے مسلک سے انحراف کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اصل دیوبندی مزاج میں توسع اور اعتدال تھا اور آج یہ توسع اور اعتدال ہمیں دیوبندی فکر کی بجائے کہیں اور نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں اپنی مرضی کی عبارات منتخب کر کے ان پر اپنا مقدمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس مقدمہ کے بطن سے پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اصل دیوبندی مزاج کی نمائندگی ان اصحابِ فکر میں نظر آتی ہے جنہیں آج کا دیوبندی مزاج تجدد پسند سمجھتا ہے۔

ان تجدد پسندوں میں سے کچھ غامدی صاحب کے خوشہ چین اور ان کے فکری جانشین ہیں۔ انہیں خود اصرار نہیں کہ انہیں دیوبندی کہا جائے لیکن ان کے چاہنے والے البتہ بضد ہیں کہ انہیں اصل دیوبندی مزاج کا مستند نمائندہ سمجھا جائے۔ کچھ وہ جن کے اپنے مزاج کا اتار چڑھاؤ غیر معتدل رہتا ہے۔ معمولی اختلاف کی خراش سے ان کے آبگینے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے جو دیوبندی فکر کی آماجگاہوں میں پلنے بڑھنے کے بعد اب فکر و عمل کے اعتبار سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ کچھ وہ جن کا لازمی مطالبہ ہے کہ اصحاب رسول کے مابین خطِ امتیاز کھینچا جائے۔ کچھ وہ فکری اپاہج جن کی شخصیت تاثر اور مفادات سے گندھی ہے۔ یہ سب وہ متبادل "تراث" ہے جس کے بارے میں دعویٰ اور مطالبہ ہے کہ اسے اصل دیوبندی مزاج سمجھا جائے۔

علامہ اقبال مرحومؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ دیوبندیت کیا ہے؟ علامہ مرحومؒ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا: "دیوبند نہ فرقہ ہے نہ مذہب۔ ہر معقولیت پسند، دین دار آدمی کا نام

دیوبندی ہے۔" اصل دیوبندی مزاج میں توسع ضرور ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ یہ تجدد کی حدوں کو چھو کر اس سے بغلگیر ہو جائے۔ توسع اور اعتدال سے متصف ہونے کے باوجود دیوبندی مزاج تجدد کے باب میں ہمیشہ حسّاس رہا ہے۔ ہر عہد کے دیوبندی مزاج نے نہ صرف تجدد کی نشان دہی کی بلکہ اس کا علمی وعملی ردّ کیا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ ان سے جب اپنے عہد کے تجدد پسند سرسید احمد خان کے بارے میں سوال ہوا تو ان کا جواب کچھ اس طرح تھا: "اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشراء اور تجارت میں کر لیویں، اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلافِ شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیعِ فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جائز ہے اور مباح ہے۔ مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ اگر چہ وہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو مگر اس کی شرکت مآلِ کار اسلام و مسلمان کو سمِ قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہر گز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا۔ اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلافِ شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت یا ترقیٔ ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے"۔

یہ تجدد کے باب میں صفِ اول کا دیوبندی مزاج ہے۔ گو اس مؤقف میں کچھ سختی در آئی ہے لیکن اس مؤقف کا حاصل یہ ہے کہ سرسید احمد خان دین کے نام پر بے دینی اور فکری انتشار کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جنت وجہنم کا انکار، معجزات کا انکار وہ میٹھا زہر تھا جسے چکھنے کے بعد ایمان سسک سسک کر مر جاتا تھا۔

مولانا قاسم نانوتویؒ دارالعلوم کے روح رواں تھے، ان کے سامنے سرسید احمد خان کا تذکرہ ہوا تو فرمایا: "ہاں! اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور درمندیٔ اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کی فسادِ عقائد سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں"۔

یہاں سرسید احمد خان کے اعترافِ عظمت کے باوجود ان کے فسادِ عقائد کی شکایت اصل دیوبندی مزاج کی خوبصورت عکاسی ہے۔ اعتدال یہ ہے کہ اعترافِ عظمت کے باوجود اگر کہیں فسادِ عقائد یا خرابیٔ دین کی صورت پیش آ رہی ہو تو اسے بھی واضح کیا جائے۔

سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد رکھی تو ایک معتمد خاص کو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ مولانا کو یہ پیغام پہنچائیں کہ مَیں نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے کالج کی بنیاد ڈالی ہے لہٰذا آپ میرا ساتھ دیں۔ مولانا گنگوہیؒ نے پیغام سن کر فرمایا: "بھئی! ہم تو آج تک مسلمانوں کی فلاح کا راستہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے سمجھتے رہے مگر آج معلوم ہوا کہ ان کی ترقی کا اور بھی کوئی راستہ ہے۔" پھر مولانا قاسم نانوتویؒ کا نام لے کر فرمایا: "وہ ان باتوں میں مبصر ہیں جو وہ فرمائیں ہم ان کی تقلید کریں گے۔"

وہ معتمد مولانا قاسم نانوتویؒ کے پاس پہنچا اور مولانا گنگوہی کا جواب سنایا۔ مولانا نے کہا: "کام کرنے والوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک نیت اچھی مگر عقل اچھی نہیں۔ دو عقل اچھی مگر نیت اچھی نہیں۔ تین نہ نیت اچھی نہ عقل اچھی۔ سرسید کے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عقل اچھی نہیں کیونکہ وہ جس زینہ سے مسلمانوں کو ترقی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور فلاح و بہبود کا سبب سمجھتے ہیں وہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہوگا۔"

یہ عبارت بھی اصل دیوبندی مزاج کی تفہیم میں کارگر ہے۔ اپنے عہد کے اربابِ تجدد کی نیت پر شک نہیں کیا مگر اس ممکنہ غلطی کی نشان دہی بھی کر دی جس کا ارتکاب ابھی سرسید نے نہیں کیا تھا۔

مولانا عبداللہ انصاریؒ مولانا قاسم نانوتویؒ کے داماد تھے۔ اپنے بزرگوں اور بڑوں کی اجازت اور مشورے کے بغیر انہوں نے علی گڑھ کالج کو جوائن کر لیا۔ مشہور یہ ہو گیا کہ وہ بڑوں کی اجازت اور مشورے سے علی گڑھ منتقل ہوئے ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے نام خط لکھا:

"مولوی عبداللہ صاحب کے حالات سن کر تعجب ہوا اور افسوس کہ باوجود دعویٰ صوفیت اور بزرگ زادگی کے اس مدرسہ کے متعلق ہو گئے جس کا نام علمائے آخرت کے نزدیک دارالالحاد ہے اور جو مذہب اور مشرب کے خلاف ہے اور یہ جو آپ سے کسی نے کہا ہے کہ وہ فقیر کی اجازت سے مدرسہ نیچریہ میں ملازم ہوئے ہیں ﴿سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ﴾۔"

(بقیہ صفحہ نمبر:۱۹)

تفہیمِ دین

مولانا یحییٰ نعمانی (لکھنؤ)

غامدی فکر کی بنیادی گمراہی کیا ہے؟ (آخری قسط)

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربیست

غامدی تصورِ دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ منصب نہیں ہے کہ ان کے ذریعے، قرآن کے علاوہ اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب میں چلی آرہی دین ابراہیمی کی روایت کے علاوہ کو نیا دینی حکم قرار دیا جائے۔ وہ اگر حدیث میں دیے گئے کسی حکم کو قبول کرتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حرام قرار دیے گئے کسی فعل کو حرام مانتے ہیں تو بس اسی وقت جب مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کی دینی روایت میں اس کی سند مل جائے؛ اسی لیے ”میزان“ (جو ان کے فہمِ دین کا مکمل صحیفہ ہے) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جو بھی احکام قبول کئے گئے ہیں ان کی سند بھی ذکر کی گئی ہے کہ بائبل میں اس کی اصل ملتی ہے یا عربوں کی جاہلیت میں اس پر عمل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تواتر سے ثابت ہے کہ آپ نے مسواک کو دینی عمل قرار دیا اور اس کا اجر وثواب بیان فرمایا۔ غامدی صاحب اس کو قبول کرتے ہیں مگر کیوں؟ اس لیے کہ جواد علی نے اپنی کتاب ”المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام“ میں المحبر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عرب مسواک کیا کرتے تھے (میزان: ۶۴۱) لا حول ولا قوۃ الا باللہ، محمد رسول اللہ کے قول کو دین قرار پانے کے لیے ابولہب، ابوجہل اور پولُس کی سند کی ضرورت ہے۔

میزان میں غامدی صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کو دین تسلیم کیا ہے کہ جس کسی کا قربانی کا ارادہ ہو وہ ذی الحجہ کے شروع سے قربانی کرنے تک نہ بال کاٹے نہ ناخُن (صحیح مسلم)۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ آپ نے اس حکم نبوی کو دین کیسے مان لیا؟ یہ تو آپ کے اصول کے خلاف ہے کہ کسی ایسی چیز کو دین مانا جائے جس کی اصل یہود ونصاریٰ یا مشرکین عرب میں چلی آرہی ملت ابراہیمی کی دینی روایت میں نہ ملتی ہو، اس کے جواب میں غامدی صاحب کے رسالے (شمارہ نومبر ۲۰۱۸ء) میں بڑی تفصیلی تحریر شائع کی گئی، جس میں دکھایا گیا کہ یہ چیز ملت ابراہیمی کی روایت میں موجود تھی اور اس میں بائبل کے بھی بہت سے حوالے

دیے گئے کہ اس لیے حدیث کے اس حکم کو دین کا حصہ مانا گیا ہے۔عجب بات یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے ہم کو ایسے بہت سے احکام ملے ہیں جن کا کوئی سراغ ملت ابراہیمی کی قدیم و موروث دینی روایت میں نہیں ملتا اور قرآن نے بھی ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے مگر غامدی صاحب ان کو تسلیم کرتے ہیں، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عیدین دین کا حصہ ہیں، کوئی ان سے پوچھے کیا عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کا رواج عہد نبوی میں ملت ابراہیمی کی روایت میں کہیں تھا؟ عرب کے مشرکانہ تہوار اور میلوں ٹھیلوں کو ختم کرکے حدیث نے ہم کو عیدین کے دینی تہوار دیے، یہ سب حدیث ہی سے ہم کو ملا ہے۔ پھر وہ عید کی نماز کو بھی لازم قرار دیتے ہیں، کیا عیدین کا کوئی تذکرہ قرآن میں ہے؟ کیا مشرکین مکہ بیت اللہ میں یا عیسائی ایلیاء میں اس کو قائم کرتے تھے؟ کیا یہود مدینے میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے؟ غامدی حلقے کو نماز جنازہ کا بھی قائل نہیں ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ انہوں نے اپنے نزدیک دین کے جو دو اور صرف دو مآخذ قرار دیے ہیں یعنی قرآن اور ''ملت ابراہیمی کی وہ روایت جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باقی رکھا اور جاری فرمایا''۔ اس روایت میں ہم کو نماز جنازہ نہیں ملتی ہے مگر غامدی صاحب اس کو دین کا حصہ مان رہے ہیں، یہ کسی طرح خدا کی عبادت والی وہ نماز نہیں ہے، جس کا حکم "اقیمو الصلوٰۃ" کہہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں میت کے لیے دعا کی ایک واجب رسم ہے اور کوئی شک نہیں کہ خدا کی عبادت والی نماز سے بالکل الگ ایک مستقل حکم اور دین کا مستقل حصہ ہے۔ یہ تمام وہ احکام ہیں جن کو اللہ کی وحی غیر متلو کے زیر حکمِ منصبِ رسالت سے دین قرار دیا گیا۔

بوالعجبی کی انتہا

غامدی صاحب کے لیے ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ ان کے بقول، قرآن نے جانوروں میں سے صرف چار چیزوں یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے جانور اور سور کے گوشت کی حرمت بتائی ہے، باقی بہت سی اشیاء کے اللہ کی طرف سے حرام ہونے کی خبر ہمیں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملی ہے مثلاً تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی، گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ، وغیرہ۔ تمام امت ان کو صرف ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی وجہ سے حرام مانتی آئی ہے تو غامدی صاحب کیا کریں؟ اگر

یہ کہیں کہ یہ سب چیزیں حرام نہیں ہیں؛ اس لیے کہ ان کے نزدیک حدیث سے تو شریعت ثابت ہی نہیں ہوتی تو بڑی گھناونی بات ہوگی اور اگر ان چیزوں کو حرام کہیں تو اپنی فکر کی ساری عمارت زمین بوس ہوئی جاتی ہے، اس مخمصے کا انہوں نے ایک حل نکالا اور کیا ''خوب'' حل نکالا، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ یہ دراصل انسان اپنی فطرت سے ہی جانتا ہے کہ یہ چیزیں گندی ہیں اور کھانے پینے کے لیے نہیں بنی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو جو حرام قرار دیا ہے وہ کوئی شریعت کا بیان اور حکم نہیں ہے، محض فطرت انسانی کا بیان ہے، ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لوگوں (یعنی پوری امت کے تمام علماء) سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ان باتوں کو شریعت کا بیان سمجھ لیا حالانکہ وہ صرف فطرت کا بیان ہیں حالانکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن نے بیان کی ہیں ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ غامدی صاحب کہتے ہیں ''جانوروں کی حلت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں'' یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور اور سور کا گوشت؛ چنانچہ قرآن نے بعض جگہ "قُل لا أجد في ما اوحي إليّ" اور بعض جگہ "اِنما" کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں (میزان: ص ٣٦) باقی وہ چیزیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا جیسے تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی، گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ وغیرہ، ان کے بارے میں جنابِ موصوف فرماتے ہیں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان باتوں کو شریعت کا بیان نہیں سمجھتے، محض فطرت انسانی کا بیان سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں "انسان کی فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے، اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دسترخوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے"۔ آگے فرماتے ہیں "بعض روایتوں میں (یہ جو) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے، اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اُسی فطرت کا بیان ہے، جس کا علم

انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے، لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، درآنحالے کہ شریعت کی اُن حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے یعنی کتا، بلی، گدھا، سانپ، بچھو، چیل اور گدھ کھانا محض فطرت انسانی کے خلاف ہے، کوئی کھائے تو یہ دینی طور پر حرام نہیں ہے" غرض بوالعجبیوں اور تضادات کی ایک دنیا ہے۔ غامدی صاحب نے ایک غلط تصور دین قائم کرلیا پھر خود ان کو اس کے نتائج کا یارانہ رہا۔ یہاں غامدی صاحب کا اصول ان سے تقاضا کرتا تھا کہ وہ کہیں کہ حدیث سے دین میں چونکہ کوئی نیا حکم ثابت ہی نہیں ہوسکتا اور ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے'' (میزان: ص ۶۱، ایڈیشن ۲۰۱۴ء) اس لیے ان کی حرمت کا خیال شریعت سے ثابت نہیں ہے، یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے کتے، بلی، گدھے، شیر چیتے، چیل، باز اور سانپ بچھو کو حرام سمجھ رکھا ہے، جب غامدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے'' اور اس سے ''دین میں کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا'' (میزان، ص: ۱۵) تو پھر یقیناوہ کتے، بلی، چیتے، شیر، گدھے اور سانپ بچھو کو دین میں حرام نہیں کہہ سکتے۔

غامدی صاحب کے انکار حدیث کا یہی منطقی تقاضا اور لازمی نتیجہ ہے مگر وہ بہت ذہین آدمی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ تو ان کے عقیدے ومسلک سے لوگوں کو متنفر کردے گا اور پھر کون مسلمان ان کے لیکچرز سنے گا اور ان کو ''اسلامی اسکالر'' مانے گا؟ اور کون ان کے حقیقی فکر کے نتائج کو سن کر کان نہ پکڑے گا کہ ایسی گمراہی سے خدا کی پناہ، اس لیے انہوں نے ایک مضحکہ خیز تاویل اختیار فرمائی اور ایسا عجیب وغریب جوڑ بٹھایا کہ یہ کسی طرح ذہن قبول نہیں کرتا کہ غامدی صاحب جیسا ذہین وزیرک انسان ایسی لچر باتوں پر کبھی اپنے دل کو مطمئن کرسکا ہوگا۔ کل کو غامدی صاحب کا کوئی خوشہ چین ان کے اسی اصول کو لے کر یہ کہہ سکتا ہے ''استاذ امام'' کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ کتا، بلی، لکڑ بگھا، چیتا، ہاتھی، گدھا اور گدھ، چیل وغیرہ انسانی فطرت کی رو سے کھانے پینے کی چیز نہیں، نہ جانے کتنی اقوام کی مرغوب غذا میں کتا اور بندر شامل ہے، چینیوں کے یہاں سانپ نہایت لذیذ وپسندیدہ کھانا ہے۔ جن اقوام نے یہ چیزیں نہیں کھائیں یہ ان کے ''کلچر'' کی روایت ہے۔ یہ مزعومہ کہ ان چیزوں سے ابا فطرت انسانی میں ودیعت

ہے اس کی کوئی دلیل سوائے ’’استاذ امام‘‘ کے ذوق کے نہیں، رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟ تو وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے موقف میں جس کو ہم نے ’’پوری قطعیت کے ساتھ واضح‘‘ کر دیا ہے، ’’یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے‘‘ لہٰذا کتے، چیتے، بلی، ہاتھی، بندر، سانپ، بچھو کو لوگوں نے غلط حرام قرار دے دیا ہے، نہ فطرت انسانی کی رو سے یہ چیزیں کھانے کے قابل ہیں اور نہ خدا کی شریعت کے محرّمات میں سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شاگرد رشید کا موقف بڑا کریہہ اور وحشت انگیز ہے لیکن ہے سو فیصد غامدی صاحب کے اصول و منطق اور ان کے دینی عقیدہ پر قائم۔ دین کے اگر غامدی اصول قبول کر لیے جائیں تو شریعت کے تین چوتھائی حصے کو دریا برد کرنا بس اسی جیسی چند تقریر ہائے دل پذیر کا محتاج رہ جائے گا۔

سارے انحراف کی بنیاد

سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت و رسالت کے ۱۴ صدیوں بعد ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ دین کا ماخذ کیا ہے؟ یہ مسلمانوں کے اگلوں نے سمجھا، نہ پچھلوں نے۔ مَیں وہ فردِ فرید ہوں جو یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا ہے کہ دین کا ماخذ کیا ہے؟ حیرت سے دماغ ششدر رہ جاتا ہے کہ غامدی صاحب جیسا ایک اچھا خاصا سمجھدار آدمی کیسی باتیں کر رہا ہے! وہ کہتا ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں ہوئے۔ یہ بھی مانتا ہے کہ وہ چمن انسانیت کے گل سر سبد اور شجر اسلام کے بہترین ثمر تھے اور یہ بھی کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ رسول، اپنے ان صحابہ کے لیے جو خلاصۂ انسانیت تھے، یہ تک واضح نہ کر سکا کہ اسلام کے ماخذ کیا ہیں؟ صحابہ کے بعد امت کی جو ساری علمی تاریخ ہے جس کے تسلسل میں تابعین عظام، ائمہ اسلام اور بے شمار علماء کی قطاریں کھڑی ہیں وہ سب دین کے معاملے میں (معاذ اللہ) ایسے جاہل و کم مایہ ہوئے کہ ان کو یہ تک پتہ نہیں چل سکا کہ دین ان کو کہاں سے لینا ہے؟ آج غامدی صاحب نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ’’دین کے لاریب صرف دو ماخذ ہیں ایک قرآن اور دوسرے ملت ابراہیمی کی وہ روایت جو یہود و نصاریٰ میں اور عرب کے مشرکین میں چلی آ رہی تھی، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی تائید وتصویب کے ساتھ امت میں دین کی حیثیت سے جاری کیا، ان دونوں کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہوسکتی ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے'' پھر طرفہ دیکھیے! غامدی صاحب اس قدر بڑا دعویٰ فرماتے ہیں اور دین کا ماخذ و اصل (Source) ایسا نیا بیان کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں بتایا اور ماشاء اللہ پوری کتاب ''میزان'' اپنے اس دعوے کی دلیل سے خالی، یعنی دلیل کے نام پر کوئی معمولی سی چیز بھی اس کی جناب پیش نہیں فرماتے کہ محمد رسول اللہ کا کوئی حکم یا تحلیل وتحریم کا کوئی ارشاد صرف اسی وقت دین اور شریعت قرار پائے گا جب وہ ملت ابراہیمی کی روایت کا حصہ ہو، اتنا بڑا دعویٰ اور حجت بس یہ کہ مَیں یہ سمجھتا ہوں، سبحانَ مظہر العجائب! خدایا! رحم فرما۔

اس تحریر کا مقصد غامدی صاحب کی تردید اور ان کے افکار کا علمی جائزہ لینا نہیں ہے، بس مطمحِ نظر یہ ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک خاص طرح کے منکرِ حدیث ہیں اور یہ کھول کر سامنے رکھ دیا جائے کہ ان کے فکر ومسلک کے کیا لازمی نتائج ہیں؟ انہوں نے اپنے نزدیک جو دین طے کیا اور اپنی کتاب میزان کے دیباچہ میں اس اظہار اور اعلان کے ساتھ پیش کیا ہے ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اس کتاب میں پیش کر دیا ہے'' اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ قرار پاسکے، ہاں! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم وارشاد کی تائید ''ملت ابراہیمی کی روایت'' سے ہوجائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم دین میں جگہ پا جائے گا، ورنہ چاہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز کو حرام کہیں یا اس کے مرتکب پر لعنت بھیجیں یا اس پر اللہ کے عذاب کی وعید سنائیں یا کسی چیز کو مِن جملہ واجبات فرمائیں اور حکم دیں وہ چیزیں ضروری یا دینی حکم کا درجہ نہیں پاسکیں گی۔ ایسے موقع پر کسی خوبصورت سی عبارت کے ذریعے ان احکامِ رسول کو غامدی دین میں ''لغو'' قرار دے دیا جائے گا؛ اس لیے کہ ان کے یہاں تو ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''۔ غامدی صاحب اپنی ان واضح عبارتوں کے باوجود اگر یہ اصرار فرماتے ہیں کہ حدیث وسنت کے بارے میں ان کا اور عام علماء سلف کا موقف حقیقت میں ایک ہی ہے، اختلاف صرف اصطلاح کا یا علمی ترتیب کا ہے، جیسا کہ انہوں نے بھی کہا ہے اور

ان کے کارپردازان وکلاء صفائی گھما پھرا کر کہتے رہتے ہیں (اور ہماری بھی دلی دعا ہے کہ ایسا ہوجائے) تو ان کو واضح طور پر اپنی اِن مذکورہ عبارتوں سے رجوع کرنا چاہیے، یہ عبارتیں انھوں نے اپنی سب سے مرکزی کتاب میں لکھی ہیں، ان کا مطلب بالکل واضح ہےاور خود ان کے رسالے نے اسی مفہوم کے مطابق ان کی آراء کی توجیہ کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ان کی رائے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی حکم یا عمل اسی وقت دین قرار پاتا ہے جب اس کی اصل ملت ابراہیمی کی قدیم روایت میں پائی جاتی ہو۔اس بنیادی مسئلے کی وضاحت کے بعد ان کی تاویلات وتوجیہات اوراختراعات کے تفصیلی جائزے کی ضرورت شاید نہیں رہتی۔ان کی بعض آراء صحیح ہوسکتی ہیں لیکن ایسی بنیادی گمراہی کا حامل شخص دین کے سلسلے میں لائق توجہ قطعاً نہیں رہتا۔ایسے حضرات سے دین سیکھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔

جس کو نہ ہو دین و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں؟

ہم اللہ سے جہاں اپنے لیے بھی ہدایت واستقامت اورتوفیق ارزانی کی دعا کرتے ہیں، اُن کے لیے بھی کرتے ہیں کہ اللہ ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین حق کی سمجھ اورامت کی بہترین نسل صحابۂ کرامؓ کے طرز پر دین کے فہم کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

۱۔ ''دین ابراہیمی کی روایت'' کے الفاظ سے یہی مفہوم واضح ہے کہ یہ وہ چیزیں تھیں جو عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ میں چلی آرہی تھیں اور غامدی صاحب نے میزان میں بھی اوراپنے بعض لیکچرز میں بھی اپنا یہی مدعا واضح کیا ہے۔

۲۔ یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث کی تبلیغ وحفاظت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ چاہیں تو انہیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں، بالکل واقعے کے خلاف بات ہے۔تاریخِ علمِ حدیث کے موضوع پر لکھی ہر کتاب حدیث کی حفاظت واتباع اوراس کی تعلیم وتلقین نیز ابلاغ کے اہتمام کے ناقابل تردید شواہد سے بھری ہوئی ہے۔

تفہیم دین

محمد ادریس (برطانیہ)

دین کا کام کرنے والے اکٹھے کیوں نہیں ہوتے؟

’’لیسٹر برطانیہ میں علماء کرام کی محفل میں ایک دفعہ شاہ ابرار الحق ہردوئی (مرحوم) نے فرمایا کہ فرض کرو کسی گاؤں میں کسی بھاری جسم والے مسلمان کا انتقال ہوگیا، جون جولائی کی گرمی ہو، قبرستان کئی کلومیٹر کے فاصلے پر ہو اور جنازہ اٹھانے والے صرف چار آدمی ہوں۔ راستے میں ایک مسافر شخص ملا۔ اس نے اپنا سامان ایک جانب رکھا اور جنازے کو کندھوں پر اٹھانے والوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ شاہ ابرار الحق صاحبؒ نے علماء سے پوچھا ان چار آدمیوں کو اس مسافر شخص کے آنے سے خوشی ہوگی یا تکلیف؟

سب علماء کرام نے کہا خوشی ہوگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ یہ پانچوں آدمی تھوڑا آگے بڑھے تو ایک اور مسافر نظر آیا۔ اس نے بھی اپنا سامان ایک سائیڈ پر رکھا اور ان پانچوں آدمیوں کے ساتھ جنازے کو کندھا دینے کے لئے شریک ہوگیا۔ حضرت نے پھر علماء کرام سے پوچھا بتاؤ کہ اس چھٹے آدمی کے آنے سے پہلے پانچ آدمی خوشی محسوس کریں گے یا تکلیف؟

سب نے کہا خوشی۔ تو پھر شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا کہ اس وقت ہم سب بھی دین کی ذمہ داری کندھوں پر اٹھا کر چل رہے ہیں، دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو ہمیں ایک دوسرے کے کام کو دیکھ کر خوش ہونا چاہیے اس لیے کہ ہم سب کا مقصد ایک ہے۔ تدریس، تصنیف، تبلیغ، جہاد، سیاست، تصوف، درسِ قرآن، درسِ حدیث یہ سب دین کے شعبے ہیں۔ اگر ہم سب ایک دوسرے کے رفیق ہوتے تو دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر شیطان ہمیں رفیق بننے نہیں دیتا۔ ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے سے متنفر کرتا رہتا ہے۔ سیرت کا ایک پہلو اتفاق بھی تو ہے جو نظر انداز ہو رہا ہے۔‘‘

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ [آل عمران ۳: ۱۰۳]

﴿وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ۚ﴾ [الانفال ۸: ۴۶]

فکرودانش

علامہ ابن خلدون [۱]

محکوم قوم کی نشانیاں

آج مغرب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی کی خواہش میں یہ سب نشانیاں مسلمانوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں

مغلوب قوم کو ہمیشہ فاتح کی تقلید کا شوق ہوتا ہے، فاتح کی وردی اور وردی پر سجے تمغے، طلائی بٹن اور بٹنوں پر کنندہ طاقت کی علامات، اعزازی نشانات، اس کی نشست و برخاست کے طور طریقے، اس کے تمام حالات، رسم و رواج، اس کے ماضی کو اپنی تاریخ سے جوڑ لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ حملہ آور فاتح کی چال ڈھال کی بھی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جس طاقتور سے شکست کھاتے ہیں اس کی کمال مہارت پر آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے ہیں۔

محکوم معاشرہ اخلاقی اقدار سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ ظلمت کا دورانیہ جتنا طویل ہوتا ہے ذہنی و جسمانی طور پر محکوم سماج کا انسان اتنا ہی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ محکوم صرف روٹی کے لقمے اور جنسی جبلت کے لیے زندہ رہتا ہے۔

جب ریاستیں ناکام اور قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ان میں نجومی، بھکاری، منافق، ڈھونگ رچانے والے، چغل خور، کھجور کی گٹھلیوں کے قاری، درہم و دینار کے عوض فتویٰ فروش فقیہ، جھوٹے راوی، ناگوار آواز والے متکبر گلوکار، بھداڑانے والے شاعر، غنڈے، ڈھول بجانے والے، خودساختہ حق سچ کے دعویدار، زائچے بنانے والے، خوشامدی، طنز اور ہجو کرنے والے، موقع پرست سیاست دانوں اور افواہیں پھیلانے والے مسافروں کی بہتات ہو جاتی ہے۔

ہر روز جھوٹے روپ کے نقاب آشکار ہوتے ہیں مگر یقین کوئی نہیں کرتا۔ جس میں جو وصف سرے سے نہیں ہوتا وہ اس فن کا ماہر مانا جاتا ہے۔ اہل ہنر اپنی قدر کھو دیتے ہیں۔ نظم و نسق ناقص ہو جاتا ہے۔ گفتار سے معنویت کا عنصر غائب ہو جاتا ہے، ایمانداری کو جھوٹ کے ساتھ اور جہاد کو دہشت گردی کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۳)

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون سے استفادہ از احمد محمود

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سرمایہ دارانہ نظریۂ ضرورت۔ایک اسلامی محاکمہ

سرمایہ دارانہ تصورِ عدل کی ایک بنیاد اس کا نظریہ ضرورت (needs) ہے۔سرمایہ دارانہ عدل یہ ہے کہ ہر شخص (یعنی ہیومن بی اِنگ) کو اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔لبرل اور اشترا کی سرمایہ دار اس تصورِ عدل پر متفق ہیں۔ان مکاتب فکر میں نزاع اس طریقہ کار سے متعلق ہے جس کے ذریعہ سرمایہ دارانہ عدل کی جستجو جاری رکھی جاسکتی ہے۔

لبرل سرمایہ داروں کی رائے میں سرمایہ دارانہ عدل کی جستجو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ ایک ایسی ریاست وجود میں آئے جو ہیومن رائٹس معاشرتی سطح پر فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتی ہو۔

۲۔ اور جو ایک مسابقتی (competitive) مارکیٹ کی آزادانہ کارفرمائی کی پشتیبان بنی رہے۔

اشترا کی سرمایہ دار ہیومن رائٹس کی فراہمی کی لازمیت کو اصولاً رد نہیں کرتے لیکن وہ اس ریاستی عمل کو اور مسابقتی مارکیٹ کی کارفرمائی کو سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ کے لیے کافی نہیں سمجھتے کیونکہ

۱۔ہیومن رائٹس کی فراہمی دولت اور آمدن کی مساویانہ/منصفانہ تقسیم کی ضمانت نہیں دیتی۔

۲۔ اور خودکار مارکیٹی عمل کی قوت متحرکہ (operative force) بڑھوتری سرمایہ برائے بڑھوتری سرمایہ (capital accumulation for sake of capital accumulation) ہے اور بڑھوتریٔ سرمایہ لازماً جمہور کی حقیقی ضرورتوں سے متعلق نہیں ہوتی۔

حقیقی ضرورتیں کیا ہیں؟

انسان کی اصلی اور ابدی حقیقی ضرورت یہ ہے کہ اس کو موت اس حالت میں آئے کہ وہ

اللہ کا مطیع ہو﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾۔لیکن یہ ہیومن بی اِنگ کی اصلی ضرورت نہیں کیوں کہ ہیومن بی اِنگ لا الہ الّا الانسان کے کلمہ خبیثہ پر ایمان لے آیا ہے۔ وہ خود ارادیت اور خود تخلیقیت کا دعوے دار ہے اور اخروی حقائق کا منکر۔ ہیومن بی اِنگ کی حقیقی ضرورت دنیاوی زندگی میں منتہائے صرف اور مسرت کا حصول ہے۔ اسی چیز کو ارسطو نے Endimonia کہا تھا۔مسرت کا جو تصور لبرل اور اشترا کی سرمایہ داروں میں عام ہے وہ بنیادی طور پر مادہ پرستانہ (materialistic) ہے اور مسرت کو ماپنے کا مقبول عام طریقہ جمہور کے صَرف (consumption) ہی میں اضافہ ہے۔ اکنامکس میں اس چیز کو welfare maximization کہتے ہیں۔

اشترا کی سرمایہ داروں کا تصورِ ہستی (being) مادی ہے۔ ہیومن بی اِنگ کی ہستی ایک مادی ہستی (being) ہے اور اس کی بقا (survival) کا انحصار ان مادی اشیا کے حصول پر منحصر ہے جو اس سے جدا کائنات میں پائی جاتی ہیں۔

ہیومن بی اِنگ کا اظہارِ ذات عملِ پیداوار اور تصرف میں ہوتا ہے۔انسان اور کائنات دونوں مادی وجود ہیں اور تصرف فی الارض کے ذریعہ ہی ہیومن بی اِنگ مادی کائنات سے وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ جیسے جیسے تصرف فی الارض کا عمل ترقی کرتا ہے ویسے ویسے ابدی حقائق واشگاف ہوتے جاتے ہیں۔ یہی سائنٹفک منہج (Scientific Method) کا بنیادی دعویٰ ہے۔

لبرل اشترا کی سرمایہ دارانہ تصور ضرورت کی مادیت کے دو کلیدی ماخذات ہیں۔ قدیم یونانی فلسفی اپی کیورس اور ڈارون یہ دونوں ہیومن بی اِنگ کو اصلاً ایک حیوانی وجود تصور کرتے تھے۔ یہ دونوں ہیومن بی اِنگ میں حیوانی جبلتوں کی عملی تقدیم پر اصرار کرتے ہیں یعنی ہیومن بی اِنگ اصلاً اور فطرتاً ایک جانور ہے۔

سرمایہ دارانہ طرزِ حیات ہیومن بی اِنگ کے تصور ضروریات کو متاثر کرتا ہے۔اشترا کی سرمایہ دار شکایت کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی صنعتی ترقی نے مزدوروں کے تصورِ ضرورت کو متاثر کیا۔تکریم، احساس فعالیت ان کی محسوس ضرورت نہ رہی۔ نہ وہ حصول تعلیم وتحفظ صحت کو اپنے لیے ضروری گردانتے تھے۔ چنانچہ اشترا کی سرمایہ دار کے مطابق

سرمایہ دارانہ نظام میں حقیقی ضرورتوں کی فراہمی سے توجہ بہت کم اور مصنوعی ضرورتوں پر زیادہ مرکوز ہوتی ہے۔

امریکی ماہر نفسیات ابراہام ماسلو نے دور حاضر کے سرمایہ دارانہ طرز حیات میں ہیومن بی اِنگ کی حقیقی ضرورتوں کی درجہ بندی کی ہے۔ اس کی درجہ بندی لبرل اور اشترا کی سرمایہ دار حلقوں میں مقبول عام ہے۔ ماسلو سے ایک صدی قبل مارکس بھی انہی حقیقی ضرورتوں کی درجہ بندی کر چکا تھا۔ ماسلو اور مارکس کے مطابق بنیادی حقیقی ضرورتیں بدنی ہیں۔ پانی، ہوا، غذا، رہائش، صحت، تعلیم ۔ اس کے علاوہ معاشرہ میں انفرادی احساس تکریم، احساسِ فعالیت اور حصول تفریحی لذات کو بھی حقیقی ضرورتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ آج ماحولیاتی تحفظ کو بھی حقیقی ضرورتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ضرورت اور طلب

ضرورتوں کی یہ مادی تعریف ان معنوں میں مبہم ہے کہ یہ اس کا تعین نہیں کرتی کہ کتنی خوراک، کتنی اور کیسی طبی اور تعلیمی سہولتیں کسی رہائش وغیرہ ہیومن بی اِنگ کی بنیادی ضرورت ہیں۔ یہ بھی واضح نہیں کہ معاشرتی تکریم، احساس فعالیت اور حصول لذات کے کیا معیارات ہیں۔ یہ تمام سطح زندگی کے اجزا تہذیبی طور پر متعین ہوتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی ضرورتیں (غذا، رہائش، صحت کی سہولیات) دور حاضر کے ہیومن بی اِنگ کی متصور بنیادی ضرورتوں سے بہت کم تھیں اور قرون اولیٰ کا تصور معاشرتی تکریم ماڈرن دور کے تصور معاشرتی تکریم سے بہت مختلف تھا۔

سرمایہ دارانہ طرز حیات معیارِ زندگی (یعنی تصورِ بنیادی ضرورت) میں مستقل اضافہ کا متقاضی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی کارفرمائی کے نتیجہ میں مستقلاً حقیقی افلاس میں کمی اور تقابلی افلاس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حقیقی افلاس میں کمی کا مطلب یہ ہے کہ جو مادی وسائل (غذا، تعلیم، رہائش ، اسباب تعیش) ایک عام ہیومن بی اِنگ کو میسر آتے ہیں ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

لیکن ارتکاز سرمایہ کے نتیجہ میں غریب اور امیر ہیومن بی اِنگ کے معیار زندگی میں فرق بھی تیزی سے بڑھتا ہے۔ یہ تقابلی افلاس ہے۔ غریب ہیومن بی اِنگ کے حقیقی معیار زندگی

میں کتنا اضافہ بھی ہو اس کی سطح زندگی امیر ہیومن بی اِنگ کے مقابلہ میں کم ہی رہتی ہے اور غریب ہیومن بی اِنگ کا احساس محرومی اس کو اپنی بنیادی ضرورتوں میں مستقل اضافہ پر اکساتی رہتی ہیں۔طلب (demand) ضرورت (Needs) میں مستقل تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

سرمایہ کار اشرافیہ طلب زدہ ضرورت کو فروغ دینے پر مجبور ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک تو جمہوری عمل کا تقاضا ہے کہ عوامی خواہشات کو پالیسی سازی کا محور بنایا جائے۔ اسی طریقہ سے تحکیم سرمایہ کی جوازیت (legitimacy) فروغ پا سکتی ہے۔ دوسرے طلب میں مستقل اضافہ کے بغیر بڑھوتریٔ سرمایہ کا عمل جاری نہیں رکھا جا سکتا۔لہٰذا ہر سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہیومن بنگ کی بنیادی مادی ضرورتیں ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں۔ بنیادی ضرورتوں میں مستقل اضافہ کی جدوجہد دنیا میں جنّت بنانے کی ایک لاحاصل کوشش ہے۔

بنیادی ضرورتوں کا تصور تاریخی/تہذیبی ہے فطری نہیں ہے۔سرمایہ دارانہ عمل طلب کو ضرورت میں مستقل تبدیل کرتا رہتا ہے۔وہ ایک ایسے ماس کلچر کو تعمیر کرتا ہے جہاں انفرادیت کی شناخت عمل تصرف سے پہچانی جاتی ہے۔تصرف اظہار ذات کا محکم وسیلہ بن جاتا ہے۔ اشتراکی سرمایہ دار کہتے ہیں کہ لبرل معاشرہ میں مصنوعی ضرورتوں کا انبار لگ جاتا ہے۔لیکن حقیقی اور مصنوعی ضرورتوں میں تفریق ناممکن ہے کیوں کہ ان دونوں اقسام کا بنیادی تحرک خواہش ہے اور خواہش ایک معاشرتی تعمیر ہے۔سرمایہ دارانہ عمل کا ایک منفی نتیجہ خواہشات کی تخریب ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرہ میں کوئی ضرورت بھی مصنوعی نہیں ہوتی کیوں کہ ہر ضرورت کا اظہار سرمایہ کی معاشرتی تحکیم کو ممکن بنانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔اشتراکی سرمایہ دارانہ ممالک چین اور سوویت یونین میں فیشن کی صنعت کا فروغ اسی رجحان کی عکاسی ہے۔

ضرورتوں کی فطری بنیاد

اس میں شک نہیں کہ انسان ایک مادی وجود بھی رکھتا ہے اور اس کائناتی قوتوں کا بھی ایک مادی اظہار موجود ہے اور اس کی ضرورتوں کی ایک مادی بنیاد بھی ہے۔ مثلاً ہر انسان کو بھوک لگتی ہے لیکن بھوک مٹھی بھر کھجوروں سے بھی رفع کی جاسکتی ہے (جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا) اور عالی شان لنچ اور ڈنر سے بھی۔ مادی ضرورتوں کو کم کرنے کی

تلقین تمام مذاہب عالم کا طریقہ رہا ہے اور ہمارے صوفیا نے حیوانی جبلتوں کی تسخیر کو روحانی ترفع کے حصول کا ایک بنیادی درجہ بیان کیا ہے۔ ہر فطری ضرورت کا اظہار لازماً تاریخی اور معاشرتی تناظر میں ہوتا ہے اور فطری ضرورتوں کی معاشرتی تعمیر ہی غالب رہتی ہے۔ ان معنوں میں سرمایہ دارانہ عمل نے فطری ضرورتوں پر قبضہ جمالیا ہے۔

فطری ضرورتوں پر سرمایہ دارانہ قبضہ سرمایہ کا معاشرتی تحکم ہیومن ضرورتوں پر تسلط کے ذریعہ میں قائم رکھا جا سکتا ہے اور پس جدیدی سرمایہ دارانہ نظام میں تعقل سرمایہ کا خواہشات پر قبضہ (اشتہارات اور میڈیا کی کارفرمائی کے ذریعے) نہایت مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ آج جس نوعیت کی فطری ضرورتوں کی تشریح رائج ہے وہ سرمایہ دارانہ تحکم کو مستحکم کرتی ہے اور اس تشریح کا ایک مقصد انسان کی فطری روحانی ضرورتوں کو مسخ کرنا، کھیل، موسیقی اور فحاشی کے فروغ کا ذریعہ بھی ہے۔

عوام میں ضرورتوں کو احساس میں بدلنا ایک تغیراتی عمل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی مخصوص ضرورتوں کو عملاً کبھی پورا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان ضرورتوں میں اضافہ اور تغیر میں بڑھوتری سرمایہ کے عمل کو جاری رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اشترا کی سرمایہ داروں کا یہ مفروضہ کہ بڑھوتری سرمایہ کے عمل کو تکمیل ضروریات کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے (خود اپنے مقداری اضافہ کا نہیں) مہمل ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں بڑھوتری سرمایہ کا عمل بڑھوتری ضروریات پر لازماً منحصر ہے اور جب تک سرمایہ کی بڑھوتری کا عمل جاری رہے گا ضروریات بڑھتی اور متغیر رہتی ہیں۔ ہیومن بی اِنگ کبھی مطمئن نہیں ہوگا اور بڑھوتریٔ سرمایہ اور ضروریات کا اضافہ اور تنوع ایک دوسرے کا ذریعہ بنتی رہیں گی۔ نفسِ مطمئنہ کا وجود ہیومن بی اِنگ (سرمایہ دارانہ فرد) کے قلب میں بالکل ناممکن ہے۔

ضرورت اور خوش حالی

سرمایہ دارانہ جدیدیت (capitalist modernity) میں ارسطو کے تصور خوش حالی کی جو تشریح رائج ہے اس کو دولت مندی کہا گیا ہے۔ مارکس نے دولت مندی (affluence) کی جو تشریح کی ہے اس کے مطابق دولت مندی اس معاشرتی حالت کو کہتے ہیں جہاں ہر ہیومن بی اِنگ اپنی تمام خواہشات اور ضرورتوں کو بلا رکاوٹ پورا کر سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں abundance ہیومن خود ارادیت (autonomy) کی تکمیل ہے، کلاسیکی لبرل فکر میں خود ارادیت کا فروغ دولت مندی پر منحصر نہیں ہے۔ ہیومن رائٹس کی فراہمی اور تحکمِ قانونِ سرمایہ کا فروغ دولت مندی میں اضافہ کا نتیجہ تصور کیا گیا ہے۔ لیکن سرمایہ کی دولت پر قبضہ کے نتیجہ میں مادی نامساویت لازماً بڑھتی ہے اور ہیومن رائٹس کی فراہمی عملاً بے معنی ہو جاتی ہے۔

ماڈرن ازم کی اشتراکی تعبیر دولت مندی کو بحیثیت نظاماتی ہدف رد نہیں کرتی بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر سرمایہ کو قومی/ عالمی سطح پر مجتمع کیا جائے اور اس کی تقسیم اور استعمال منصوبہ بندی کے ذریعہ منظم کی جائے تو وہ ایسی خوشحالی کا ذریعہ بن سکتی ہے جس میں سرمایہ دارانہ انفرادیت خود انحصاری ہو جائے۔ منصوبہ بند اجتماعی سرمایہ کاری تمام مادی ضرورتوں اور خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یوں ہیومن بی اِنگ فطرت پر اپنا ارادہ مسلط کر سکتا ہے اور ایسی دنیا تخلیق کر سکتا ہے جس کا خالق وہ خود ہے۔

ماڈرنٹی کا وجہ الوجود (raison d'etre) خوش حالی کے حصول کی جستجو ہے۔ خوش حالی کی یہ جستجو خود تخلیقیت کا اظہار ہے۔ خوش حالی کی ماڈرنسٹ جستجو کا پہلا اظہار (جو سولھویں صدی سے ظاہر ہوا اور آج تک کارفرما ہے) سامراج ہے۔ خوش حالی کی جستجو میں اس وقت سے لے کر آج تک یورپ اور امریکا اور روس اور چین اور بھارت اور اسرائیل تقریباً ایک ارب انسان قتل کر چکے ہیں اور پوری دنیا میں لوٹ مار کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سامراجی حکمتِ عملی کا بنیادی محرک حصولِ خوش حالی کی جدوجہد ہی ہے۔

خوش حالی کی جدوجہد کا دوسرا اظہار ماحولیاتی اور وبائی بحران کی شکل میں نمایاں ہو رہا ہے۔ خوش حالی کے حصول کی جدوجہد دنیا کو جنت نہیں جہنم بنا رہی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی بڑھ رہی ہے۔ کائناتی درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سمندری تیزابیت بڑھ رہی ہے۔ جنگلات اور ان میں پائی جانے والی حیاتی اقسام معدوم ہو رہی ہیں۔ 2020-21ء میں کووڈ نے تقریباً ایک کروڑ انسان مارے اور نئی وبائیں پھوٹنے کا خطرہ مستقل بڑھتا جا رہا ہے۔ توقع کی جا رہی ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر دنیا انسانیت کے لیے ناقابل رہائش ہو جائے گی۔

یہ سب بھی خوش حالی کی جدو جہد جاری رکھنے کا نتیجہ ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خوش حالی کی جدوجہد نامعقول ہے۔ یہ جدوجہد انسانی محرومیوں اور یاسیت (alienation) کو فروغ دیتی ہے۔ اور فطرت سے ایسی جنگ جاری رکھتی ہے جس کا لازمی نتیجہ شکست کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ دولت مندی کا عالمی حصول ممکن نہیں کیونکہ جب فرد اپنے نفس کو حرص اور ہوس اور حسد اور غضب کے شیاطین کے سپرد کر دیتا ہے تو اس کی مادی خواہشات اور ضروریات کے بڑھنے کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ کبھی مطمئن نہیں ہوسکتا کیونکہ اپنے وجود کی روحانیت کا انکار کر دیتا ہے اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ اطمینان قلب تو صرف اللہ کے ذکر میں ہے۔

سرمایہ دارانہ عدل کا قیام ناممکن ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظاماتی اہداف آزادی، مساوات، خوش حالی نامعقول ہیں۔ انسان فطرتاً ہیومن بی انگ نہیں۔ وہ نہ خود تخلیقی ہے نہ کائنات پر اپنا ارادہ مسلط کرسکتا ہے۔ وہ ہدایتِ الٰہی کا محتاج ہے اور زندگی گزارنے کے صحیح اہداف واقدار خود متعین کرنے سے قاصر ہے۔

خواہشات اور اجنبیت

انسانی وجود مادی ضرور ہے لیکن صرف مادی نہیں۔ انسانی وجود کی نوعیت ملکوتی بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ طرز حیات میں روحانی جبلتوں کے اظہار کو مسخ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سرمایہ دار امیر غریب، دولت منداور مفلس، مینجر اور محنت کش، سرکاری اہل کار اور نجی سرمایہ کار، سب حیاتی بے مقصدیت اور اجنبیت کا مستقل شکار رہتے ہیں۔ سب کے لیے زندگی لایعنی ہو گئی ہے اور آزادی اور خود تخلیقیت کے معاشرتی دعووں کے باوجود سب کے لیے زندگی لاچارگی اور بے چارگی کا مظہر بن گئی ہے۔ انفرادیت سرمایہ دارانہ معاشی عمل میں محصور ہے اور چونکہ بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ کا یہ عمل لایعنی ہے۔ لہٰذا اس کی منطق کی اسیر انفرادیت عدم معنویت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لامعنویت کی تحدید کرنے سے لبرل جمہوری عمل قاصر ہے کیوں کہ سرمایہ دارانہ مارکیٹ عمل ہی سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام کو جنم دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظم میں گرفتار انفرادیت اصولاً کوئی بھی طرزِ زندگی اختیار کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن عملاً وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ طرز حیات قبول کرنے پر مجبور پاتی ہے۔ اس

تناظر میں خود ارادیت اور خود انحصاریت کے ماڈرنسٹ دعوے ناقابل عمل ثابت ہوتے ہیں اور سرمایہ دارانہ تعقل کی اسیر انفرادیت نظاماتی دعویٰ آزادی اور خود مختاری اور نظاماتی عمل کے جبر کے مابین معلق ہوتی چلی جاتی ہے۔ ماڈرنٹی کی غیر اقداریت اور خود ارادیت کے دعوے ناقابل حصول ثابت ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں سرمایہ دارانہ تعقل (rationality) کا تسلط خود اختیاریت کی جستجو کو ناممکن بناتا رہتا ہے۔ تکمیل خواہشات کی جدوجہد جب بڑھوتری سرمایہ کی جستجو میں ضم ہوجاتی ہے تو حیاتی لامعنویت کا عام ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد اپنی ضروریات وخواہشات کی وہ تشریح قبول کرنے پر مجبور ہے جو بڑھوتری سرمایہ کا عمل وضع کرتا ہے۔ سرمایہ اپنی تکنیکی اختراعات کے ذریعے وقت پر قابض ہو جاتا ہے۔ خود اختیاریت لایعنی ہوجاتی ہے اور فرد ہمہ وقتی طور پر سرمایہ کی غلامی پر مجبور ہوجاتا ہے۔ سرمایہ کی وقت پر اجارہ داری ریاست جمہوری عمل کے ذریعہ مسلط کرتی ہے۔

سرمایہ دارانہ انفرادیت لازماً غیر محفوظ، دائمی خطرات کا شکار اور تضاداتی ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد اشیا (commodities) کا انبار لگا رہتا ہے اور اس کی مادی ضروریات لامحدود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ملکوتی / روحانی ضروریات کا احساس فنا نہیں ہوتا مسخ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ تفریح اور تعیش کے ذریعے روحانی تسکین حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔

سرمایہ کی غلامی دائمی پریشانی کو جنم دیتی ہے۔ مذہب کھیل تماشا بن جاتا ہے اور سکون قلب کے حصول کے لیے فرد اولیاء اللہ سے نہیں سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ سب ضروریات کی سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔ جو معاشرہ بھی سرمایہ دارانہ تعقل کو قبول کرلے گا وہاں فرد ریاست کو اپنے طرز حیات کے طور پر قبول کرنے پر مجبور ہوجائے گا کیوں کہ یہ سرمایہ دارانہ تعقل کا منطقی تقاضا ہے جس کا اظہار ضروریات میں لامحدود اضافہ اور ان کے حصول کے ذریعہ دائمی ناآسودگی سے ہوتا ہے۔

یاسیت کا خاتمہ وقت کو سرمایہ کی گرفت سے آزاد کرنے پر منحصر ہے۔ اس عمل کو de-commodification of time کہتے ہیں۔ وقت کو سرمایہ کی گرفت سے آزاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وقت مادی اشیا کی پیداوار تبدل اور تصور میں کم سے کم کھپایا جائے چونکہ مادی

خواہشات میں تخفیف۔ یاسیت/اجنبیت مادی دنیا میں پیوستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ مادی خواہشات ضروریات کو کم کیے بغیر یاسیت (alienation) سے نجات نہیں پائی جا سکتی۔

وقت کی de-commodification ایک سیاسی عمل بھی ہے۔ دورِ حاضر میں ریاست غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے کیونکہ ریاست ہی وہ قوت ہے جو تحکمِ قانونِ سرمایہ کو معاشرتی سطح پر معطل کر سکتی ہے اور وقت کے غیر سرمایہ دارانہ استعمال اور تنظیم کی قدر متعین کر سکتی ہے۔ ریاست ہی وہ قوت ہے جو خود انحصاریت کے فراڈ کو طشت از بام کر سکتی ہے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ریاستی عمل عوام کی محسوس ضروریات میں تبدیلی کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔ ایک غیر سرمایہ دارانہ اسلامی ریاست کی کارفرمائی ضروریات کی تحدید اور تصحیح کے لیے لازمی ہے۔ ریاست غالب معاشرتی تعقل کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تعقل کی تخریب کاری ریاستی عمل کے بغیر ناممکن ہے۔

اسلامی تحریکیں اور نظریۂ ضرورت

دورِ حاضر کی اکثر اسلامی تحریکیں (مجاہدینِ اسلام کے علاوہ) سرمایہ دارانہ نظاماتی تناظر میں غلبۂ دین اور تحفظِ دین کی جدوجہد جاری رکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظاماتی تضادات کو مہمیز دے کر ہی اپنی جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ تضادات کا اظہار اس کے نظریہ اور عمل میں فرق سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار فروغ خود اختیاریت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ عمل فرد کے اختیار کو سلب کر کے اس کو سرمایہ کا غلام بنا دیتا ہے۔

اس بنیادی نظاماتی تضاد کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ عدل کی طرف مراجعت کرنے والی تمام تحریکیں ناکامی کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔ ان ناکام تحریکوں میں دور حاضر کی بیش تر اسلامی تحریکیں بھی شامل ہیں۔

دور حاضر کی بیش تر اسلامی تحریکیں سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کو اقامت دین کا وسیلہ بھی سمجھتی ہیں۔ ان کی ناکامی کے دو مظاہر ہیں۔ ایک تو یہ ان کی جدوجہد سیکولر جماعتوں کی طرح نہایت محدود نتائج کے حصول کا ذریعہ بن رہی ہے۔

دوسری اور اہم ترین ناکامی یہ ہے کہ اس قسم کی جدوجہد کے نتیجہ میں یہ جماعتیں اپنی

اسلامی شناخت کھوتی جارہی ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے مخلص اور دیانت دار خدام کا روپ اختیار کرتی جارہی ہیں۔

بحیثیت اسلامی انقلابی ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ سرمایہ دارانہ ظلم کی وقوع پذیری سے سہوِ نظر کرلیں اور اپنی مزاحمت کو نظریاتی سطح تک محدود کرلیں۔ مثلاً ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم ملکی معیشت پر سامراجی غلبہ یا بے روزگاری کے پھیلاؤ یا پانی کی قلت کی سیاسی اور تمدنی مزاحمت نہ کریں۔ لیکن ہماری اور دہریہ جماعتوں کی اس قسم کی مزاحمت میں ایک فرق ہونا چاہیے۔

دہریہ جماعتوں کی مزاحمتی جدوجہد کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام ساختی تغیرات کے ذریعہ مخصوص سرمایہ دارانہ ناانصافیوں کا دفع کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی انقلابی مزاحمت کا مقصد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص سرمایہ دارانہ ظلم کی موجودگی اس کے کل نظاماتی جبر اور نامعقولیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلامی انقلابی مزاحمتی جدوجہد کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا چاہئیں:

۱۔ مزاحمت یک جہتی نہ ہو بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمہ گیر جہدوجہد میں پیوست ہو۔

۲۔ مزاحمت کا ایک اہم مقصد سرمایہ دارانہ تحکم اور ساختی کارفرمائی کو کمزور کرنا ہو۔ مثلاً بے روزگاری کے پھیلاؤ کے خلاف جدوجہد محض احتجاج اور مطالبات پر اکتفا نہ کرے بلکہ حلال رزق کی فراہمی کو بھی منظم کرے۔ بازار کی سطح پر غیر سودی اور غیر غرری تمویلیت کو بھی فروغ دے۔ پانی کی قلت کے خلاف جدوجہد چھوٹے ڈیموں کی تعمیر اور محلہ تک آب رسانی کے ذرائع کے فروغ کا بھی انتظام کرے۔

۳۔ مزاحمت کا مقصد افراد کے ہاتھوں میں مقامی اقتدار کا بتدریج اجتماع ہو جو اسلامی اقدار اور اطوار کے حامل ہوں۔ مزاحمتی مہمات کا بنیادی انقلابی مرکز محلہ کی مساجد ہوں اور مساجد کا ایک ایسا ملک گیر نیٹ ورک قائم کیا جائے جو لوکل گورنمنٹ کا متبادل بن جائے۔

۴۔ اس امر کا خصوصی انتظام کیا جائے جو مخلصینِ دین نظاماتی سطح پر با اقتدار بنائے

جائیں ان میں اوران کے ذریعہ عوام میں اسلامی اطوار اور اخلاقیات فروغ پائیں۔

۵۔ مزاحمتی تحریک عوام کی بڑھتی مادی طلب اور خواہشات کی تصدیق نہ کرے بلکہ مخلصین دین کے ذریعہ عوامی سطح پر قناعت، ایثار، توکل اور انفاق کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس بات کا خصوصی خیال کیا جائے کہ اسلامی جدوجہد سوشل ڈیموکریٹک قالب میں نہ ڈھل جائے اور اسلامی انقلابی عوام کی نظروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے مخلص خادم کا روپ نہ دھار لیں۔ اسلامی دعوت ضرورتوں میں اضافہ کی جوازیت مرتب کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے بلکہ اس کا واحد مقصد مخلصین دین کے نیم ریاستی مقامی اقتدار کو فروغ دینا ہو۔

اسلامی ریاست سرمایہ دارانہ ریاست نہیں ہوتی۔ وہ عوام کو یہ دھوکا نہیں دیتی کہ دنیا میں جنت بنائی جاسکتی ہے اور سرمایہ دارانہ عدل کا قیام ممکن ہے۔ ہمارے کسی امام نہ امام ماوردیؒ نے، نہ امام شیبانیؒ نے، نہ امام ابن خلدونؒ نے، نہ امام ابویعلیؒ، نہ امام خیرآبادیؒ نے، نہ امام شاہ ولی اللہ (رحم اللہ اجمعین) نے "بنیادی ضرورتوں کی فراہمی" کو اسلامی ریاست کے فرائض میں شمار کیا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ ریاست ہی ہے جو ضرورتوں میں مستقل اضافہ کرتے رہنے کا وعدہ کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں سماجی کفالت کو منظم کرنے والے فطری ادارے خاندان، برادریاں، مذہبی اجتماعیتیں، اوقاف معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں اور فرد اپنی معاشرتی شناخت کھو کر اجنبیت اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلامی ریاست فلاحی ریاست نہیں جہادی ریاست ہوتی ہے۔ امارت اسلامیہ افغانستان اور اسلامی جمہوریہ ایران دونوں جہادی ریاستیں ہیں۔ انقلابی جہدوجہد کے دوران اور اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی ان دونوں ریاستوں کے انقلابیوں نے عوامی خواہشات کے فروغ کے وعدے نہیں کیے بلکہ عوام کی اسلامی عصبیت کو ابھارا، ان کے جذباتی ایثار کی پرورش کی اور ان کو اپنی آخرت سنوارنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ملکوں کو نہایت نامساعد حالات اور کڑی آزمائشوں کے باوجود ایرانی اور افغان عوام کی غالب اکثریت اسلامی انقلابی حکومت کی حمایت کرتی رہی ہے اور اس کو تکمیل ضروریات کی بنیاد پر ورغلانے کی بیش تر سامراجی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

اسلام اور مغرب سید خالد جامعی

عالمِ اسلام میں مغرب جیسی ترقی کیوں ممکن نہیں؟ (آخری قسط)

جدید سائنس عیسائیت سے مادہ پرستی تک

جدید سائنس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیں مادیت پرستی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ عیسائیت سے مادیت تک کا یہ سفر کیسے طے ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار تھا؟ یورپ میں نصف سے زیادہ زمینوں کی ملکیت کا کلیسا کے پاس ہونا، کلیسا کا دولت پرستی میں مبتلا ہونا، قوت کے زعم میں مظالم کا ارتکاب، یونانی سائنسی نظریات کو عیسائی الٰہیات و اعتقادات کا حصہ بنانے کے بعد اس کے سائنسی ابطال کو تسلیم کرنے سے انکار اور ان مذہبی سائنسی نظریات کے ابطال کرنے والوں پر بہیمانہ تشدد، Inquisition کی تاریخ جب کلیسا نے ہزاروں عیسائی مردوں اور عورتوں پر مظالم کئے، قتل کیا، عورتوں کو زندہ جلایا، کلیسا کے اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں کلیسا کی شکست، کلیسا کی دنیا پرستی، تشدد اور بربریت کے ردعمل میں پروٹسٹنٹ ازم کا فروغ، تحریکِ تنویر، تحریکِ رومانویت، قومی ریاستوں کا قیام، سرمایہ داری کا وجود، جدید فلسفہ اور جدید سائنس کا فروغ، نوآبادیات کا قیام، نوآبادیات کے قیام کے نتیجے میں دولت کی لوٹ مار اور اس کا دور دراز سے سمٹ کر یورپ میں جمع ہونا، سرمایہ دارانہ فکر کا ارتقاء، سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ، امریکی ریاست کا قیام، بنیادی حقوق کے منشور کی تاریخ وغیرہ وغیرہ، ان مباحث پر گہری نظر کے بغیر جدید سائنس کے حیرت انگیز ارتقاء کی کہانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان زرعی ملک تھا لیکن پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی، یہی دولت ایجادات کا باعث بنی۔ برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کننگھم نے لکھا ہے کہ ''ایجادیں اتنے بڑے پیمانے پر صرف اس لیے نہیں ہوئیں کہ جیسے لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی ہو، اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکٹھا ہوگیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہوگیا تھا''۔ اس موضوع پر Leo Huberman کی کتاب *Man's Worldly Goods* بہت سے حقائق آشکار کرتی ہے،

جس کے اقتباسات ہم شروع میں پیش کر چکے ہیں۔ نو آبادیات میں لوٹ مار کی کہانی مائیکل مین کی کتاب Dark Side of Democracy اور رومیل کی کتاب Death by Government میں پڑھی جا سکتی ہے۔ مائیکل مین کہتا ہے کہ نسلی قتل عام مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے جس کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی جو مغربی تہذیب کی بہیمیت کا فطری جواز مہیا کرتی ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

"Thus unfortunately for us murderous ethnic cleansing is not primitive or alien. It belongs to our own civilization and to us, most say this is due to the rise of nationalism in the world and this is true."

پچاس کروڑ لوگوں کی لاشوں اور کھربوں روپے کی لوٹ مار پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ لوٹ مار کی یہی دولت اس حیرت انگیز سائنسی ترقی کی بنیاد بنی جو آج ہر شخص کو فطری، حقیقی، ضروری اور عین اسلامی معلوم ہوتی ہے۔ کیا مذہبی ریاستیں جبر و استبداد اور لوٹ مار کا مذہبی جواز فراہم کر سکتی تھیں؟ مذہبی معاشروں میں اس بہیمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ عیسائیت کی خامیوں، کوتاہیوں اور مذہبی استبداد کے باوجود اس کا موازنہ اگر مہذب، متمدن، جدید سائنسی یورپی انسانوں کی لوٹ مار، دہشت گردی سے کیا جائے تو ہمیں مذہبی دور (جو مغرب کی اصطلاح میں Dark Age یعنی تاریک دور ہے) جدید دور (Enlightened یعنی روشن خیال) کے مقابلے میں زیادہ شریفانہ، محبت والا اور قابل رشک نظر آئے گا۔ اس کے ظلم و جبر بھی لامحدود نہیں تھے، محدود ہی تھے کیونکہ عسکری آلات بھی اسی علمیات کے نتیجے میں تیار ہوئے تھے، جس کے مطابق تمام مخلوق اللہ کا کنبہ سمجھی جاتی تھی اور اس کنبے کی ہولناک تباہی کا تصور الہامی مذاہب میں نہیں پایا جاتا تھا۔ مذہبی تہذیبوں کی سائنس ایٹم بم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، مغربی فکر و فلسفے سے نکلنے والی "خلقِ جدید" کی بہیمیت کی اس تاریخ کو اور سرمایہ داری کی ابتدائی تاریخ کو پڑھے بغیر سائنسی ایجادات و ترقی کا سبب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں جو مظالم ہوئے ہیں اور براعظموں کو جس طرح لوٹا گیا ہے خصوصاً امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ، ایشیا اور وہاں کے لوگوں کو جس طرح تہس نہس کر کے مال لوٹا گیا اس کے

نتیجے میں صنعتی ترقی اور سائنس کا پہیہ چلا ہے۔ صنعتی ترقی کے لیے کروڑوں افریقی غلام استعمال ہوئے اور ہلاک کئے گئے، غلاموں کا اس طرح استعمال کسی مذہبی معاشرے میں نہیں ہوا۔ سترویں صدی سے پہلے ہونے والے عیسائیوں کے مظالم Inquisition وغیرہ بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ پھر سرمایہ داری نے مزدور کا جو حشر کیا وہ عبرتناک ہے، جاگیرداری کے زمانے میں بھی ظلم تھا لیکن محدود اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ سائنسی ترقی میں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری اسی لوٹ کے مال سے کی گئی۔

ہم لوگ سرمایہ داری کے آغاز ارتقاء کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں لہٰذا سائنسی ایجادات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی جتنی سائنسی تحقیقات ہو رہی ہیں اس کے پیچھے سرمایہ کس کا ہے؟ سائنسی تحقیقات کا مقصد کیا ہے؟ انسانیت کی خدمت یا دولت کمانا؟ دولت کمانا ہی اصل مقصد ہے لہٰذا یہ محرک تیزی سے ایجادات کا سبب بن رہا ہے لہٰذا سائنس یا اس کی ترقی کو مغرب کے فلسفے، تاریخ، مابعد الطبیعیات، نوآبادیات میں لوٹ مار، تصور انسان، تصور نفس، تصور کائنات اور تصور آخرت کو سمجھے بغیر مجرد دیکھنا اور سمجھنا مناسب نہیں ہے۔ کوئی مذہبی ریاست دوسروں کو لوٹ کر ترقی کا پہیہ نہیں چلا سکتی۔ ایسی ظالم ترقی پر غیر ترقی یافتہ معاشرے کو ترجیح دینا دین کا تقاضا بن جاتا ہے۔ سائنس اب ٹیکنالوجی کی محتاج ہو چکی ہے اور ٹیکنالوجی سرمایہ کی محتاج ہے اور سرمایہ صرف سرمایہ کے ذریعے ہی اپنی مقدار میں اضافہ کر سکتا ہے لہٰذا سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داری کے مثلث کے بغیر سائنسی ترقی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ چونکہ ٹیکنالوجی پر بھاری سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے لہٰذا سرمایہ کار صرف ان شعبوں میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ کاری کرتا ہے جہاں سے وہ بھاری منافع حاصل کر سکے، اس کے نتیجے میں سائنس کے افق بڑھنے کی بجائے سکڑ رہے ہیں اور سائنس و ٹیکنالوجی صرف سرمایہ داری کے بہترین خدمت گزار بن گئے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری طب، آلات حرب و ضرب، تفریحات اور تعیّشات فسق و فجور کی صنعتوں میں ہو رہی ہے، جس کا علمی نام میڈیکل ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے۔

جدید سائنس و ٹیکنالوجی کو اس حال تک مادیت پرستی کے مغربی فلسفے نے پہنچایا تھا۔

پہلے پہل سائنس مغربی فکر و فلسفے کے آلہ کار کے طور پر کام کر کے اس کے آدرشوں کی تکمیل کر رہی تھی لیکن انیسویں صدی کے بعد سائنس فلسفے سے الگ ہوگئی اور اب وہ خود ایک علم بن چکی ہے حالانکہ دنیا کی تاریخ میں سائنس اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ دنیا کا پہلا فلسفی تھیلس سائنسدان بھی تھا۔ تھیلس کے فلسفے اور سائنس کا مقصد حقیقت مطلق تک رسائی تھا وہ نہیں جو آج کی سائنس اور فلسفے کا محور و مرکز ہے کہ دنیا کی زندگی کو کس طرح خوبصورتی سے بسر کیا جائے اور زمین کو جنت بنا دیا جائے۔ تمام بڑے بڑے سائنسدان فلسفی تھے لیکن بیسویں صدی میں صرف سائنسدان پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ سائنسدان فلسفی نہیں ہیں لہٰذا سائنس کی سمت اور اہداف مقرر کرنے والا کوئی عامل باقی نہیں رہا، اس پر نقد کرنے والا کوئی ادارہ اس سے وابستہ نہیں رہا لہٰذا جدید سائنس جو اول دن سے آزادی کی قدر پر اپنے وجود کا اظہار کر رہی تھی اب بے مہار ہوگئی ہے اور اس کے پیدا کردہ خطرات کا ازالہ مشکل ہو گیا ہے، ماحولیاتی آلودگی اس کی ایک مثال ہے۔

جدید سائنس کی اسلامی صورت گری

اس جدید سائنس کی اسلامی صورت گری ممکن ہی نہیں البتہ عارضی طور پر دفاعی ضرورت کے پیش نظر اس سے حدود کے اندر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت پسندوں کے نقطۂ نظر سے عروج تو صرف اور صرف سائنس سے ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پہلے ان گنت دولت جمع کر لیں، اس دولت کو جمع کرنے کا موقع اب مغرب تو آپ کو نہیں دے گا پھر مغرب کا مقابلہ کیسے ہوگا؟ مطلب مسلمانوں کے پاس زوال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ زوال ہی ان کا مقدر ہے کیونکہ تاریخ کا سفر ختم ہو گیا ہے، اب مغرب کا فکر و فلسفہ اور اس کا طرز زندگی ہی آخری سچ ہے لہٰذا اسلام سے دستبردار ہو کر مغرب کو اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے مذہبی جدیدیت پسند مفکرین اصلاً یہی بات کر رہے ہیں لیکن استدلال یہ ہے کہ مغرب اور اسلام میں صرف کلمے کا فرق ہے۔ مسلمانوں کے طرزِ زندگی میں آخرت کو مرکزی مقام حاصل ہے، جب یہ مقام پسِ پشت ڈالا گیا اور فتوحات، قصرۃ الزہرہ، باغات، محلات، مقبرے زندگی کا مقصد بن گئے تو نتیجتاً مسلمان قبرستان کی اذان ہو گئے۔ آج بھی ہم مادیت پرستی کے طریقوں میں مبتلاء ہیں،

مغرب کی نقل کر کے اسے شکست دینا چاہتے ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ کیا ہے؟ دین انبیائے کرام علیہم السلام کے طریقے سے غالب ہوگا خواہ یہ طریقہ ہمیں پسند ہو یا نہ ہو، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام (موسیٰؑ، نوحؑ، شعیبؑ، لوطؑ، محمدؐ،) کے اپنی قوم سے مکالمے پڑھ لیجئے ایک ہی پیغام ہے جو تمام چیزوں کا احاطہ کرتا ہے، دعوت دین۔ غلبۂ دین محض اسی طریقے سے ہوگا، انبیائے کرام علیہم السلام بھی اسی طریقے کے مطابق دعوت کا کام کرنے کے پابند تھے۔ کیا انبیائے کرام علیہم السلام نے سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے انقلاب برپا کیا؟ کیا دنیا میں انبیائے کرام علیہم السلام کا انقلاب مادی ذرائع پر منحصر ہے؟ ضروریات کے تحت، مجبوریوں کے تحت بہت سی چیزیں اختیار کی جاتی ہیں، کی جاسکتی ہیں اور ہمیشہ کی جاتی رہی ہیں لیکن وہ مقصد نہیں ہوتا، وہ ایک عارضی اور وقتی مرحلہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جوہری طاقت حاصل کرنا اب مجبوری ہے کیونکہ دشمن اسے ایجاد کر چکا ہے، مجبوری میں اسے اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن کوشش اسی بات کی ہوگی کہ مہلک جوہری ہتھیاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، خواہ محبت سے خواہ طاقت سے۔ اس کے بنانے والوں کو فساد فی الارض کے جرم میں عبرتناک سزا دی جائے اور انہیں نمونہ عبرت بنا دیا جائے لیکن اس کے لیے نعرے بازی اور ہنگامہ آرائی کی اجازت نہیں۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو قرآن کریم نے انبیاء کے ذریعے امت پر قیامت تک کے لیے واضح کر دیا ہے۔

ہر وہ تحریک اور فرد جو علم، عمل، کردار اور یقین کی دولت اور جاہلیت کی حقیقت سے واقفیت کے بغیر مغرب کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے گا اسے عبرتناک شکست ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا "وعلی العاقل ان یکون بصیرًا بزمانه" "دانا شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کو جاننے والا ہو"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ ’’مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا۔ جس نے اسلام میں نشوونما پائی اور جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو‘‘۔ جدیدیت پسند مفکرین کا المیہ یہی ہے کہ انہوں نے مغرب جیسی "جاہلیت خالصہ" کا علم حاصل کیے بغیر اس کی تائید وتوثیق کر کے اسلام کی کڑیاں بکھیر دیں، امت کے علماء وصلحاء نے اس عمل کو اپنی محنتوں سے روک دیا ہے لیکن اب بعض

علماء بھی اس عمل میں شریک ہو رہے ہیں، یہ علماء انگریزی بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مغرب کے علوم فلسفے وغیرہ سے قطعاً ناواقف ہیں۔ یہ خطرناک معاملہ ہے، دین کے اصل محافظ علماء ہی ہیں وہی اس کا تحفظ کر سکتے ہیں، مغرب کو جانے بغیر اور سائنس و سوشل سائنسز کی تاریخ سے واقفیت کے بغیر مغرب کی غیر علمی تائید خطرناک عمل ہے۔ جدید سائنس بندگی کے تصور کو ختم کر کے خدائی کا دعویٰ کرتی ہے۔ فوکو نے کہا تھا انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔ نطشے نے اعلان کیا تھا خدا مر گیا ہے۔ فوکالٹ نے اس پر اضافہ کیا کہ انسان بھی مر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دل مر جائے تو زندگی کی رونقیں اور انفس و آفاق کی حقیقتیں بھی مر جاتی ہیں اور انسان فی الحقیقت مر جاتا ہے۔ عقل کا مقام دل ہے، یہ دل زندہ ہو تو مابعد الطبیعیاتی حقائق بھی سمجھ میں آتے ہیں، مغربی تہذیب اور جدید سائنس نے انسان سے اس کا قلب چھین لیا ہے۔ مادی ترقی کرنے والی ہر قوم گناہوں میں مبتلا ہے کیونکہ زندگی کا مقصد صرف لہو ولعب ہے اور اس کے لیے ایجادات کا سیل رواں چلا آ رہا ہے۔ مغلوں کے زمانے میں تمام توجہ فرج اور شکم پر تھی، لہٰذا دنیا میں سب سے عمدہ کھانے اور حکیموں کے کشتے ہندوستان سے مخصوص ہیں۔ یونانیوں کے یہاں حسن اور فکر و فلسفے کو مرکزی مقام حاصل تھا لہٰذا ان کی تہذیب، علوم، فلسفے اور جمالیات میں اس کا کمال ملتا ہے۔ ایام جاہلیت میں عربوں کا مرکز توجہ خطابت، شاعری اور حرب وضرب کے مضامین تھے لہٰذا اس معاملے میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں ہے۔ مغرب نے دنیا کو مقصد بنا لیا ہے۔ تاریخ انسانی میں دنیا میں کسی قوم، تہذیب، تمدن اور امت نے اتنی ترقی نہیں کی جیسی ترقی مغرب کو نصیب ہوئی ہے لیکن یہ ترقی روحانیت کا زوال ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کسی تہذیب و تمدن نے دولت اور ارتکاز سرمایہ حرص و حسد کی عالمگیریت، لذت دنیا، ارتکازِ مال، خواہشِ نفس کو زندگی کا مقصد، مقصدِ بندگی اور عبادت کا مقام نہیں دیا، اس لیے دنیا کی کسی تہذیب نے ایسی ترقی نہیں کی جو مغرب کے حصے میں آئی ہے کیونکہ مغرب کی الٰہیات، مابعد الطبیعیات اور علمیات، تقسیمِ علوم سب کچھ الگ ہے۔

عالم اسلام

پروفیسر ڈاکٹر شمس الحق حنیف[۱]

مسئلہ فلسطین - تاریخی پس منظر اور حقائق (آخری قسط)

بہر حال یہودیوں نے 1948ء میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان ایسے حالات میں کر دیا جب کسی نے انہیں اعلان کرنے کا کہا نہیں تھا، یہاں تک کہ (برطانیہ نے ان سے وعدہ قومی وطن کا کیا تھا قومی حکومت کا نہیں، اگرچہ اس سے بھی ان کا جرم ہلکا نہیں ہوتا)۔ اقوام متحدہ میں اجلاس جاری تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ کہ اسی اثناء میں یہودیوں نے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اقوام متحدہ، برطانیہ اور صہیونی موومنٹ نے دولت کی تجوریوں کا منہ کھول دیا۔ لوگوں کو پیسے دینے شروع کر دیے، برطانوی حکومت کے مقرر کردہ کمشنرز، پولیس اور فوجی جو وہاں موجود تھے، وہ کسی فلسطینی کے ہاتھ میں چاقو بھی دیکھ لیتے تو اسے گرفتار کر کے پھانسی چڑھاتے تھے جبکہ یہودیوں کو مفت میں اسلحہ بانٹ رہے تھے اور انہیں مسلح کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے مسلمانوں کی جائیدادوں پر اتنے بھاری ٹیکسز لگانے شروع کر دیے کہ ان کے لیے جائیداد رکھنا بھی تقریباً ناممکن ہو گیا، جب لوگ یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تھے تو ان کی جائیداد بحقِ سرکار ضبط کر لیتے تھے۔ ضبط کر لینے کے بعد یا تو برائے نام قیمت پر وہ یہودیوں کو الاٹ کر دی جاتیں یا ویسے ہی بطور انعام ان کے نام منتقل کر دی جاتیں۔

جب یہ بات چل نکلی کہ یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کا عمل ہونا چاہیے تو اس وقت یہودیوں کو دنیا کے گوشے گوشے سے بُلا کر وہاں جمع کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور تقریباً 6 لاکھ یہودیوں کو وہاں جمع کر کے وہاں آباد کر دیا گیا تھا۔ وہ جب زمین تقسیم کر رہے تھے تو نہ ہی فلسطینیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اور نہ ہی دنیا کے دیگر مسلم ممالک سے پوچھا گیا، اس کے باوجود فلسطین کا 55 فی صد حصہ یہودیوں کو دے دیا گیا اور باقی 45 فیصد عربوں کو دیا گیا۔ یہودیوں کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ ُاے اسرائیل! تیری

[۱] پشاور میڈیکل کالج، پشاور۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر ہے جسے مضمون کی شکل دی گئی ہے۔

سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں' اس کا معنی یہ ہوا کہ مصر سے لے کر عراق تک کا پورا علاقہ جس میں شام، اردن، فلسطین، مدینہ منورہ اور ترکی کے بعض علاقے شامل ہیں، اسرائیل کی ریاست میں شامل کرنے کا منصوبہ ہے۔ ترکی کے علاقے 'اُر' جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، پر بھی یہودیوں نے نظریں جمائی ہوئی ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی ریاست نہیں پائی جاتی جس نے کھل کر یہ اعلان کیا ہو کہ ہم فلاں فلاں ممالک پر قبضہ کریں گے۔ صیہونی نظام تعلیم ایک ایک یہودی بچے کو یہ سبق پڑھا رہا ہے کہ یہ سارا علاقہ تمہارا وطن ہے، جس پر دوسروں نے قبضہ جمایا ہوا ہے۔

بعض کمیونسٹ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس معاملے میں روس کا کوئی کردار نہیں ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ 1967ء کی جنگ جس میں قبلہ اول بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، مصر کے بعض علاقے بھی اسرائیل نے چھین لیے، شام سے بھی گولان کے علاقے چھین لیے، اردن سے بھی مغربی علاقہ (جسے ویسٹ بینک کہا جاتا ہے) چھین لیا گیا۔ مصر کی اس وقت کی حکومت جب اسرائیل سے جنگ کے لیے تیار ہو رہی تھی تو روسیوں نے فون کر کے انہیں اطمینان دلایا کہ تمہارے اوپر کوئی حملہ نہیں کر رہا اور پھر اچانک یہودیوں نے حملہ کر کے ان کے متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ لہٰذا روس کا بھی اس معاملے میں باقاعدہ کردار رہا ہے جبکہ امریکہ، برطانیہ وغیرہ تو یہودیوں کی مستقل سرپرستی کرتے آرہے ہیں۔

1922ء میں فلسطین میں مردم شماری کرائی گئی تھی جس کے بعد دوبارہ یہ نوبت نہیں آئی۔ جب وہاں مردم شماری ہوئی تو یہودیوں کی کل تعداد 82 ہزار سے کچھ زیادہ، عیسائیوں کی تعداد 71 ہزار سے کچھ زیادہ جبکہ مسلمانوں کی تعداد 7 لاکھ سے زیادہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جب زمین کی تقسیم ہو رہی ہو تو جو قوم تعداد میں 7 لاکھ ہو اس کو کتنا حصہ ملنا چاہیے اور جو یہودی اور عیسائی مل ملا کر بھی ڈیڑھ لاکھ نہیں بنتے انہیں کتنا حصہ ملنا چاہیے؟ اس کے باوجود زیادہ حصہ یہودیوں کو دیا گیا اور کم حصہ مسلمانوں کو دیا گیا۔

پھر بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مان لیا کہ 45 فیصد حصہ مسلمانوں کا ہو (اگرچہ ان کی آبادی زیادہ ہے) اور باقی حصہ یہودیوں کا ہو (اگرچہ ان کی آبادی کم ہے) اس

سب کے باوجود موجودہ وقت میں 75 فیصد حصے پر یہودی قابض ہوگئے ہیں اور ہر جنگ کے نتیجے میں وہ مزید علاقوں پر قبضہ کئے جارہے ہیں۔ پوری دنیا میں ایک اسرائیلی ریاست ہی ایسی ہے جس کی سرحدیں ابھی تک متعین نہیں ہیں، وہ ہر طرف اپنے پاؤں پھیلاتی جارہی ہے۔ ان یہودیوں کو جو گھر یا عمارت پسند آجاتی ہے اس کے مالک کو حکم دیتے ہیں کہ یہ گھر اب تمہارا نہیں رہا، لہٰذا اسے مسمار کردو ورنہ اگر ہم اسے مسمار کردیں گے تو پھر سارے اخراجات بھی تم ہی سے وصول کریں گے۔ وہ اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے پناہ گزین کیمپوں پر بھی چڑھ دوڑتے ہیں۔ پچھلے دنوں جبالیہ کیمپ پر حملہ کردیا گیا ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کو سکول جاتے ہوئے پکڑ لیتے ہیں اور گرفتار کرلیتے ہیں۔ پھر بھی حیاء سے عاری ایسے لوگ موجود ہیں جو 7 اکتوبر کے حملوں پر اُلٹا حماس ہی کو موردالزام ٹھہرارہے ہیں۔

ایسے لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا 7 اکتوبر سے قبل وہاں امن وامان قائم تھا؟ اسرائیلی جیلوں میں جو بدترین سلوک وہ فلسطینیوں سے روا رکھتے ہیں آپ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ یہاں تک کہ سکول جانے والے معصوم بچوں کو بھی معاف نہیں کرتے، انہیں بلاوجہ پکڑ کر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ بیت المقدس کی مسجد کے بارے میں انہوں نے آرڈر جاری کیا ہے کہ 45 سال سے کم عمر کا کوئی شخص وہاں نماز پڑھنے نہیں جاسکتا۔ پھر دوسرا حکم جاری کیا کہ 60 سال سے کم عمر لوگ وہاں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ بتدریج اس عمر کو بڑھاتے بڑھاتے اب 75 سال تک پہنچا چکے ہیں۔ یہ ذلت، بے عزتی اور ظلم کی انتہاء آخر کیوں؟ وہاں زیتون کے قیمتی باغات میں جاکر درختوں کو کاٹ کاٹ کر تباہ وبرباد کردیتے ہیں، اگر کوئی منع کرے تو کہتے ہیں کہ یہ ہمارا علاقہ ہے تم کون ہوتے ہو ہم سے پوچھنے والے؟ اور اعتراض کرنے والے کو فوراً گرفتار کرکے دہشت گردی کا لیبل لگادیتے ہیں۔

جب صورتحال اس نہج پر پہنچ گئی تو تب کہیں جاکر مسلمانوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مزاحمت کی جائے گی، یہیں سے حماس کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ حماس دراصل ”حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ“ Islamic Resistance Movement کا مخفف ہے جو یہودیوں کے ان مظالم کے خلاف قائم کی گئی یہ مسلمانوں کی ایک عظیم الشان تحریک ہے۔ اس تحریک کے بانی

شیخ احمد یاسین شہیدؒ ہیں جو ایک عظیم انسان تھے۔ آپ آنکھوں کی بینائی سے محروم اور ٹانگوں سے معذور تھے، وہیل چیئر پر گھومتے تھے۔ انہوں نے 1985ء میں اس تحریک کی داغ بیل ڈالی، بعد میں یہودیوں نے میزائل مار کر انہیں شہید کر دیا جب وہ فجر کی نماز پڑھ کر اپنی وہیل چیئر پر کر گھر جا رہے تھے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے سنا ہے، 1985ء سے قبل انہوں نے ایک بات کہی تھی اگرچہ میں زیادہ یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اس بات سے ہمیں ایک اشارہ ضرور ملتا ہے، وہ بات یہ تھی کہ انہوں نے فرمایا ’میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، اگر 2027ء تک حضرت عیسیٰؑ آسمان سے واپس تشریف نہ لائے تو میری قبر کو سنگسار کر دینا‘ یہ ان کے الفاظ کا مفہوم ہے، انہیں اپنی بات کے سچی ہونے پر کامل یقین تھا، اللہ نے انہیں حماس جیسی ایک پاکیزہ تحریک بنانے کی توفیق دی جس کے مجاہدین نے امریکیوں کو بھی بدحواس کر دیا ہے اور یہودیوں کو بھی۔

اس تحریک کے بارے میں کچھ لوگ یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ ایک شیعہ تحریک ہے حالانکہ یہ صد فیصد جھوٹ اور بہتان ہے۔ لبنانی حزب اللہ یقیناً شیعوں کی تحریک ہے، ان کے پاس ایرانی اسلحہ بھی ہے، ایران ان کو سپورٹ بھی کر رہا ہے اور انہیں مالی تعاون بھی دیتا ہے۔

اسرائیل کی سرحدوں سے متصل ممالک میں اردن ہے جس کے ساتھ اسرائیل کی جنگ بھی ہوئی ہے اور وہ اس کے شدید مخالف ہیں۔ غزہ سے مصر کی سرحد ملتی ہے، ان سے بھی اسرائیل کی جنگ ہو چکی ہے۔ لبنان کی سرحد بھی اسرائیل کے ساتھ لگی ہوئی ہے جہاں پر حزب اللہ والے ہیں۔ لہٰذا حزب اللہ الگ تنظیم ہے اور حماس الگ تنظیم ہے، حماس والے غزہ میں ہیں، (اسی طرح یمن کے انصار اللہ بھی ہیں جو حزب اللہ کی بہ نسبت زیادہ قابل اعتماد اور صیہونی ریاست کے مقابلے میں درست اور دوٹوک مؤقف رکھتے ہیں)۔

اب غزہ کی اصل صورتحال کیا ہے؟ بعض لوگ غزہ اور فلسطین کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔ فلسطین میں دراصل مغربی کنارہ کا وہ علاقہ بھی ہے جسے ویسٹ بینک بھی کہتے ہیں جبکہ غزہ ایک خاص پوائنٹ ہے۔ اس کی سرحد مصر کی جانب صحرائے سیناء کے ساتھ ملتی ہے (جسے رفح کراسنگ کہتے ہیں) صحرائے سیناء مصر کا علاقہ ہے، غزہ کا بعض حصہ سمندر کے ساتھ لگا ہوا

ہے اور کچھ حصہ اسرائیل کے ساتھ، اسرائیل اور غزہ کے درمیان ایک باڑ لگا ہوئی ہے اس میں ایسے ڈیوائسز لگائے گئے ہیں جو وہاں ہونے والی معمولی حرکت کو بھی ڈیٹیکٹ کر لیتے ہیں اور یہودیوں کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ حماس کے حملوں کا انہیں کیونکر پتہ نہ چل سکا؟ آج کل پروپیگنڈے کی بھی کثرت ہے اس لیے ایسے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب حماس نے اپنی تحریک شروع کر دی تو وہاں یاسر عرفات تھے جن کی تنظیم فری فلسطین آرگنائزیشن (فیلو) کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس تنظیم کا موجودہ سربراہ محمود عباس ہے وہ فلسطین کا صدر بھی ہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ فلسطینی اتھارٹی کا صدر محمود عباس اصل میں بہائی فرقے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ بہائی فرقہ ایک گمراہ فرقہ ہے جو خود کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن ان کے عقائد اور نظریات مختلف ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے حج کا بھی اپنا سسٹم بنایا ہوا ہے، یہ لوگ ہمارے ہاں بلوچستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔

حماس بنیادی طور پر ایک جہادی تنظیم ہے۔ 2006ء میں فلسطین اور غزہ کے علاقے میں الیکشن ہوا، جس میں حماس کو فتح ہوئی، جب حماس نے یہ الیکشن جیت لیا تو یہودیوں اور امریکیوں کے ساتھ پوری دنیا یہاں تک کہ یاسر عرفات والی پارٹی پر بھی زلزلہ طاری ہو گیا۔ اب اصولاً تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جس طرحِ غزہ میں حماس کی حکومت قائم ہوئی تھی بالکل اسی طرح فلسطین کے دیگر علاقوں میں بھی قائم ہو جاتی لیکن امریکہ اور یہودیوں کے اشاروں پر اسی محمود عباس نے بغاوت کر دی اور اعلان کر دیا کہ میں حماس کی حکومت کو نہیں مانتا اور نہ ہی ان کے اختیارات کو مانتا ہوں۔ دوسری طرف اس نے فلسطین میں اپنی الگ حکومت کا اعلان کر دیا۔ حقیقت میں حماس پورے فلسطین پر حکمرانی کی حقدار تھی کیونکہ انہوں نے پورے فلسطین میں الیکشن جیت لیا تھا لیکن امریکہ و برطانیہ کے پیسوں اور پروپیگنڈے کے نتیجے میں وہاں محمود عباس ہی کو برقرار رکھا گیا اور اسی کی حمایت جاری رکھی گئی۔ آج بھی آپ دیکھیں کہ فرانس سے میکرون آتا ہے تو اس سے محمود عباس ہی ملاقات کرتا ہے، امریکی عہدیداروں سے بھی وہی ملاقاتیں کرتا ہے۔ محمود عباس سے سوال یہ ہے کہ تم کس حیثیت سے یہ ملاقاتیں کرتے ہو؟ تم آزادیٔ فلسطین کے لئے کر کیا رہے ہو؟

پھر 2007ء میں ایک اور تنظیم 'اسلامی جہاد' کے ذریعے حماس کے ساتھ غزہ میں جنگ شروع کروادی گئی کیونکہ وہ وہاں اکٹھے رہ رہے تھے، جواب میں حماس نے اس تنظیم کو مار مار کر غزہ سے بھگا کر نکال باہر کر دیا۔ اب غزہ اگر بچا ہوا ہے اور یہودی وہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں تو یہ حماس ہی کے خوف سے ہے، ورنہ باقی محمود عباس والے فلسطین میں تو انہیں مکمل آزادی اور پورے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ محمود عباس کی حیثیت وہاں ایک پولیس مین سے زیادہ نہیں ہے جسے وہاں بٹھایا گیا ہے۔ اس کے اپنے کوئی اختیارات نہیں ہیں بلکہ وہ وہی کرتا ہے جسے کرنے کا یہودی اسے حکم دیتے ہیں۔

اب آخر میں اس طرف آتا ہوں کہ 7 اکتوبر 2023ء کو حماس مجاہدین نے جو کچھ کیا اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اور کیا نتائج نکلیں گے؟ اور ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے؟ اصل بات یہ ہے کہ حماس کے پاس اس کاروائی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں بچا تھا، ان کی زمینیں ہتھیا لی گئی تھیں، ان کی عزتوں کو داؤ پر لگا دیا گیا تھا اور پورے غزہ کو یہودیوں نے محاصرہ میں لے لیا تھا، نہ تو کوئی وہاں اندر جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی باہر آ سکتا تھا۔ ایک جانب سے یہودی ان کو نہیں چھوڑ رہے تھے، دوسری جانب سمندر ہے، تیسری طرف مصر والے حکمران بھی یہودیوں کے ایجنٹ بنے ہوئے ہیں۔ جنرل سیسی تو یہودیوں کا ایجنٹ ہے وہ تو اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ رفح کراسنگ سے پانی لے جانے والے ٹرک ہی غزہ جانے دے تاکہ وہاں پیاس سے بلکتے مسلمان پانی ہی پی سکیں۔ اتنے کام کے لیے بھی سیسی کو نیتن یاہو کے ساتھ ٹیلی فون رابطہ کرنا پڑتا ہے اور اجازت لینی پڑتی ہے۔ وہ اسے ایک دو ٹرک کی اجازت دے دیتا ہے اور پھر اسی طرح واپس راستے کو بند کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ وفادار غلام کی طرح اس کے احکامات کا پابند بنا ہوا ہے حالانکہ دعویٰ اسلام کا کرتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اہل غزہ اور حماس والے جائیں تو کہاں جائیں؟ لہٰذا ان کے پاس سوائے اس کارروائی کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی بڑی تیاریاں انہوں نے کر رکھی ہیں۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب کو قرآن وسنت کی تعلیم دینے کا بندوبست کر دیا اور انہیں جہاد کی لذت سے آشنا کر دیا ہے۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ حماس والوں نے تو اپنے لوگوں کے ساتھ بہت بُرا کیا، خود تو زمین کے نیچے سرنگیں کھود کر محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جبکہ عوام کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تکلیف آپ کو ہے یا غزہ کے عوام کو؟ ان کے زخم خوردہ جسموں کو دیکھ کر آپ بہت زیادہ درد میں مبتلا ہیں یا وہ خود؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان کے لیے عملاً کیا کچھ کر رہے ہیں؟ مَیں نے کہا کہ مجھے فلسطین یا غزہ کا کوئی ایک باشندہ ایسا دکھا دیں جس نے کہا ہو کہ حماس والوں نے انہیں مروا دیا ہے؟ یا ان کی وجہ سے میرا گھر برباد ہو گیا ہے؟ میں نے ایک ویڈیو کلپ دیکھی جس میں 45 سال کے لگ بھگ عمر کا ایک شخص جس کے آٹھ بچے اسرائیلی بمباری میں شہید ہو گئے تھے، ہاتھوں میں چاکلیٹ سے بھرا ایک ٹوکرا اٹھایا ہوا تھا اور وہ ان چاکلیٹس کو ایسے اچھال اچھال کر لوگوں میں تقسیم کر رہا تھا جیسے شادی کے موقع پر خوشی سے ٹافیوں کو اچھالتے ہیں۔ کسی نے پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میرے آٹھ بچے جنت میں چلے گئے ہیں، لہٰذا مجھے مبارکباد دو۔ یہ فلسطینی قوم ہے جس کی ایمانی عظمت و بلندی کا آپ جیسے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اس کا کیا فائدہ ہوا؟ تو سنیے! اس کا فائدہ یہ ہوا کہ غیرت منداور بے غیرت کا فرق واضح ہوا۔ یورپی کہتے ہیں کہ ہم ہیومن رائٹس کے علمبردار ہیں۔ اس حملے کے نتیجے میں آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ ان کے ہاں انسانوں کے حقوق کیا کچھ ہوتے ہیں؟ یہ بھی پتہ چل گیا کہ ان کے ہاں مسلمانوں کا کوئی انسانی حق نہیں ہوتا، مسلمان کو وہ جینے کا حق بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ لوگوں کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ انسانی حقوق کا جو راگ وہ دن رات الاپتے رہتے ہیں ان کا مسلمانوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا مقصود دراصل ان کے اپنے بچے ہوتے جب ہم انہیں Save the Children's کی آواز لگاتے سنتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ جب وہ کہتے ہیں کہ جس کی سرزمین پر قبضہ کیا جائے اسے مزاحمت کرنے کا حق ہے تو اس حق کا حقدار مسلمان نہیں سمجھا جاتا اور مسلمان کو اس حق سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ذرا ہمت کر کے ہمیں بتائیں نا جو بے شمار قرار دادیں فلسطین کے حق میں پاس ہوئی تھیں وہ کس سرد خانے میں پڑی ہیں؟

پھر بھی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ یہودیوں کو بھی دفاع کا حق حاصل ہے؟ بھئی کس چیز کے دفاع کا حق؟ کیا غزہ یہودیوں کی ملکیت ہے جس پر فلسطینیوں نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے؟ کیا اس لئے ان کو دفاع کا حق ہے؟ 1917ء کے بعد جو بھی یہودی باہر سے آکر یہاں آباد ہوا ہے وہ اپنا بوریا بستر گول کر کے یہاں سے رفو چکر ہوجائے اور جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے، یہاں اس کا وطن کہاں سے آگیا؟

پھر کہتے ہیں کہ دو ریاستی حل کی طرف جانا چاہئے، کون سی دو ریاستیں؟ دو ریاست کا کیا مطلب ہے؟ فرض کریں اگر آپ کے گھر پر ڈاکو حملہ کر کے کچھ لوگوں کو قتل کردیں، کچھ کو زخمی اور قیدی بنائیں اور آپ کے گھر پر قبضہ کرلیں تو کیا آپ عمائدین قوم کے اس فیصلے پر راضی ہوجائیں گے کہ آپ کے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا آپ کو اور باقی آدھا ڈاکوؤں کو دے دیا جائے؟ اور جب ڈاکو آدھے گھر پر قبضہ کرلیں تو اس پر بس بھی نہ کریں بلکہ باقی نصف پر دست درازی کر کے پورے گھر پر دعویٰ کرنا شروع کردیں؟ کیا آپ بخوشی اپنا گھر ان کے حوالے کر کے چلتے بنیں گے؟ یا اگر کوئی ملک کسی امریکی ریاست پر قبضہ کرے تو کیا امریکی قوم ان قابضوں کو بھی دفاع کا ویسا ہی حق دے گی جس طرح اسرائیلیوں کو دے رہی ہے؟ امریکہ کے اصل باشندے ریڈ انڈینز تھے، یہ ان کا آبائی اور جدی پشتی علاقہ تھا، انہی گوروں نے ان کا قتل عام کر کے اور انہیں مار مار کر وہاں سے نکال دیا اور ان کے ملک پر قبضہ کرلیا؟ آسٹریلیا والوں نے وہاں کے اصل باشندوں کو وہاں سے نکال دیا یہ غاصبوں کا ٹولہ اور بدمعاشوں کا اکٹھ ہے، یہ لاتوں کے بھوت ہیں جو باتوں سے سیدھے نہیں ہوتے۔ لہذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ حماس کے پاس اس حملے کے علاوہ کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔

مجاہدین حماس کے اس حملے نے دنیا کی بڑی طاقتوں کو بدحواس کردیا ہے۔ ایک طرف امریکی کہتے ہیں کہ ہم نیتن یاہو کے ساتھ کھڑے ہیں لیکن دوسری طرف اس معاملے کو حل کرنے کا بھی کہہ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انتروگیسیو بھی کہہ رہے ہیں کہ میری بات کوئی نہیں سن رہا، پتہ نہیں کیا بنے گا؟ ایک امریکی ڈائریکٹر نے، جو دوسرے ممالک کو اسلحے کی ترسیل پر فائنل دستخط کرتا تھا، استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ یہ جو تم اسرائیل کو اسلحہ بھیج رہے ہو یہ تم غلط کام

کررہے ہو، اس کا کوئی حق نہیں بنتا ہے۔

اسی طرح برطانیہ،فرانس اورامریکہ کے لوگ بھی اس کے خلاف اپنی آواز بلند کررہے ہیں یہاں تک کہ اسپین کی ایک خاتون وزیر نے کہا کہ میرا غصہ انتہاء کو پہنچ گیا ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کھڑا کررہا ہے اور دنیا کو دکھارہا ہے کہ کون لوگ منافق ہیں؟اور یہ بھی دکھارہا ہے کہ سچا مسلمان کون ہے؟ جہاد سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بھی ایسی اہم تر چیز نہیں ہے جس کے ذریعے دنیا کے لوگوں کو سمجھایا جائے،اسی جہاد کے نتیجے میں لوگوں کو اسلام کی سمجھ آرہی ہے۔

ایک چھوٹا فلسطینی بچہ جس کے سر سے پاؤں تک پٹیاں بندھی ہوئی ہیں لیکن وہ دوسروں کو تسلیاں دے رہا ہے۔ایسا بچہ بھی ہے جس کا اپنا گھر برباد ہوگیا ہے، پورا خاندان ختم ہوگیا ہے اور وہ خود بالکل اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔دوسرا آکر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا صورتحال ہے؟ وہ جواب میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیات سنا دیتا ہے ﴿وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿155﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَؕ ﴿156﴾﴾[البقرہ۲: ۱۵۵،۱۵۶]''اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے تمہاری آزمائش کریں گے۔ان حالات میں جو لوگ صبر کریں۔اور جب کوئی مصیبت پڑے،تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے انھیں خوشخبری دے دو''۔

ڈھونڈ کر بھی آپ کوئی ایسا شخص سامنے نہیں لاسکتے جو یہ کہے کہ حماس والوں کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا یا یوں کہے کہ انہوں نے اسرائیل پر حملہ کرکے غلط کام کیا ہے۔

لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ آخری معرکہ ہے اور یہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔یہودی کہتے ہیں کہ چونکہ امریکہ اور برطانیہ ہمارے ساتھ ہیں اس لئے اس جنگ کے نتیجے میں ہم مزید علاقے اسرائیل میں شامل کردیں گے اور ہم حماس کو ختم کردیں گے لیکن اب کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آنے لگا ہے کہ حماس کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ بدحواس ہوگئے ہیں۔مؤمن دراصل جہاد ہی کے نتیجے میں کفار کو بدحواس کردیتا ہے۔مسلمانوں کو حکم دیا گیا

ہے کہ اسلحہ جمع کرو، قرآن نے ہمیں جو ہدایت دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ساری عمر بس اسلحے ہی جمع کرتے رہو بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ تم جہاد کرو گے تو دشمن نے جو اسلحہ تیار کیا ہے وہ بھی آپ کو مل جائے گا۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿وَاَوۡرَثَكُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَدِيَارَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا﴾ [الاحزاب ۳۳:۲۷] اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ کا یہی مفہوم ہے۔

میں تو پیشینگوئیاں نہیں کرتا اور نہ بزرگی کے دعوے کرتا ہوں اور نہ ہی یہ معاملہ دعوؤں کا ہے لیکن مجھے میری چھٹی حس یہ بتا رہی ہے کہ اگر ہم کچھ عرصہ مزید زندہ رہے تو صرف دو سال بعد آپ کو پتہ چل جائے گا کہ یہ ڈالر کس چیز کا نام ہے۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ ان ڈالروں سے کوئی استنجا بھی نہیں کرے گا، ڈالر کی کوئی حیثیت اور ویلیو باقی نہیں رہے گی۔ خود امریکیوں کو بھی اس بات کا علم ہو چکا ہے۔ وہاں دس پندرہ سالوں سے ایسی تحریکیں چل رہی ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ یہ یہودی ہمارے کندھوں پر سوار ہو چکے ہیں، کیا ہم ان کے لیے جنگیں لڑیں گے؟ ہم جو ٹیکس دیتے ہیں کیا ان کے مفادات پورے کرنے کے لیے دیتے ہیں؟ افغانستان میں 20 سال تک ہمارا پیسہ کیوں برباد کیا گیا؟ وہ کہتے ہیں کہ اس میں ہماری ذاتی کوئی دلچسپی نہیں ہے اس میں اگر کسی کی دلچسپی ہے تو وہ یہودی ہیں۔ تو آخر یہ یہودی کیوں ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے ہیں؟ کیا ہم ان کے غلام ہیں؟

چنانچہ یہ احساس رفتہ رفتہ وہاں کے لوگوں میں پیدا ہوتا جا رہا ہے، اس احساس کے نتیجے میں امریکی پریشان ہو گئے ہیں۔ ایک طرف وہ اس بات پر حیران ہیں کہ عوام کو ہم اسلام سے جتنا دور کرنا چاہتے تھے وہ اتنا ہی اسلام کے قریب ہوتے جا رہے ہیں، وہ جب ایک ایک فلسطینی کے ایمان اور ثابت قدمی کو دیکھتے ہیں تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟ عقیدہ تو اصل میں انہی کا عقیدہ ہے۔ اس وجہ سے لوگ اسلام کی طرف راغب ہوتے جا رہے ہیں۔ آج جس طرح انہوں نے ہاتھوں میں فلسطین کا جھنڈا اٹھایا ہوا ہے، ان شاء اللہ کل ان کے ہاتھوں میں قرآن مجید ہوگا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ جہاد کا سبق ہے ہی

کچھ اس طرح، یہ سب کچھ جہاد کے نتیجے میں ممکن ہو جاتا ہے۔

دیکھیے! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتی میدان میں بھی بہت کام کیا، دروس اور مواعظ بھی ارشاد فرماتے رہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ مکہ میں 13 سال کی محنتِ شاقہ کے بعد کل ملا کے دو ہزار لوگ بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، پھر جب مدینہ منورہ میں جہاد کا آغاز ہوا تو جنگ بدر میں 313 لوگ تھے، اُحد میں 1000 تھے جو منافقین کی پسپائی کے بعد 700 رہ گئے۔ پھر جنگ خندق میں سارے اہل مدینہ شامل تھے، صرف چھ سال بعد صلح حدیبیہ کے موقع پر 1400 صحابہ کرام ؓ تھے جو موت کے منہ میں جانے پر بخوشی آمادہ ہوئے اور جب مکہ پر چڑھائی ہوئی تب دس ہزار 10,000 کی تعداد میں تھے۔ چند سالوں میں بات سینکڑوں سے ہزاروں تک پہنچ گئی۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ فتح مکہ کے چند دنوں بعد ہی جب بنو ثقیف کی جانب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چل پڑے تو 12,000 تک تعداد پہنچ گئی۔ ایک سال بعد جنگ تبوک کے لیے 30,000 لوگ نکلے، پھر ایک ہی سال بعد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ بیس ہزار تک تعداد پہنچ گئی۔ یہ سب جہاد کے سبب تھا لہٰذا اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر دنیا میں اسلام کا غلبہ چاہتے ہو اور دین کو غالب دیکھنا چاہتے ہو اور چاہتے ہو کہ لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو جائیں تو پھر جہاد کا راستہ اختیار کرو۔

آخری بات مَیں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی حالت بھی افسوسناک ہے۔ میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ گزرنے کے ساتھ ہمارے مسلمان حکمرانوں کے (جن کے پاس ہر قسم کا جدید اسلحہ اور فوجیں موجود ہیں) جرم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں اور آپ تو بے بس ہیں ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو وہ صرف ہماری زبانیں ہیں، لیکن جن لوگوں کے پاس مختلف قسم کے اسلحے اور بم ہیں، فوجیں ہیں اور جن کے پاس ہر قسم کے اسباب جنگ موجود ہیں اور پھر بھی وہ فلسطینیوں کی مدد کے لیے کچھ نہیں کرتے ان کے جرم میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اس نے مہلت دی ہوئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مہلت کب ختم ہو گی؟ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کو دی گئی مہلت اب ختم ہو جائے، دنیا کی مہلت بھی ختم ہونے والی ہے اور طاقتور لوگوں کی مہلت بھی ختم

ہونے والی ہے اور پوری دنیا کا موجودہ نقشہ بھی مکمل تبدیل ہونے والا ہے۔ یہ محض جذباتی باتیں ہرگز نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں میں عقیدے کی بنیاد پر کررہا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ''فلسطین اوران کے اطراف واکناف میں ایسے لوگ ہوں گے جو قیامت تک حق پر ڈٹے رہیں گے وہ ہرگز حق سے منہ نہیں موڑیں گے خواہ ان کو بہت زیادہ تکالیف اور مصائب کیوں نہ برداشت کرنے پڑ جائیں''۔ (۱)

لہٰذا ہمیں اپنی حالت پر رونا چاہیے نہ کہ فلسطینیوں کی حالت پر، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اور ہمارا واسطہ کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کس بات کے دعویدار ہیں؟ کن لوگوں کے ساتھ ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہے؟ اور کن لوگوں کے زیرِسایہ ہم زندگی گزار رہے ہیں؟ اس بات پر ہمیں رونا چاہیے۔ قطر اور لیبیا جیسے چھوٹے سے ممالک اور دیگر چند غیر مسلم ممالک نے امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات ختم کردیئے، اسرائیل نے ترکی سے اپنا سفیر واپس بلا لیا جب طیب اردوگان نے مظاہرے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے ایمان کا مظاہرہ آذربائیجان اور لیبیا میں کیا ہے، اور میں یہودیوں کو بھی اپنی غیرتِ ایمانی دکھاؤں گا۔ اس بات پر اسرائیلی سفیر نے واپسی کی راہ لے لی۔

یہ بات سمجھ لیں کہ یہ آخری پوائنٹ ہے۔ پہلی جنگ عظیم بھی پوری دنیا میں نہیں پھیلی، اسی طرح دوسری جنگ عظیم بھی لڑی گئی لیکن پوری دنیا میں نہیں پھیلی، پھر روس نے یوکرائن پر حملہ کردیا تو لوگوں نے اس خدشے کا اظہار کردیا کہ شاید اس سے تیسری جنگ عظیم برپا ہوجائے لیکن برپا نہیں ہوئی۔ جنگِ عظیم اگر بنے گی تو القدس کی لڑائی سے بنے گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہاں تمام انبیائے کرامؑ کی امامت کی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخری پیغمبر ہیں۔ یہی بات گفتگو کے آغاز میں بھی مَیں نے آپ کے سامنے رکھی تھی اور اب اختتام پر بھی اسے دہرا رہا ہوں۔ لہٰذا یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ یہ جنگ ختم ہوگی، یہ بات بھی ذہن سے نکال دیں کہ اب مزید دنیا پر کفر کا راج باقی رہے گا۔ یہ بات بھی ذہن سے نکال دیں کہ بے دین اور

---

(۱) مسند احمد بن حنبل، حديث ابی امامة الباهلي الصدی بن عجلان بن عمرو بن وهب الباهلي عن النبی ﷺ، حديث: ۲۲۳۷۴

منافق اور اللہ کے دشمن اب مزید مسلمانوں کو دھوکہ دے سکیں گے۔ بس! رات جتنی لمبی ہو آخر صبح کا سورج طلوع ہو ہی جاتا ہے۔ اگرچہ یہ رات بہت لمبی تھی لیکن اب سورج طلوع ہونے والا ہے۔

اب ہم اور آپ کیا کریں؟

تو ہمارے کرنے کے بہت سارے کام ہیں۔ پہلا کام یہ کریں کہ اس بات کو سمجھ لیں اور ذہن میں بٹھالیں۔ دوسرا کام یہ کریں کہ اتنی تمیز اپنے اندر پیدا کرلیں کہ سچ اور جھوٹ میں فرق کرسکیں کہ دوستی کے لائق لوگ کون ہیں اور دشمنی کے قابل لوگ کون ہیں؟ ان کی پہچان پیدا کریں۔ یہ بات بھی جان لیں کہ اگر ایسے حالات یہاں پیدا ہوگئے تو پھر آپ کس صف میں کھڑے ہوں گے۔ آج رات تنہائی میں بیٹھ کر اپنے رب سے مناجات کرلیں، تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے سربسجود ہوکر اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں کہ دنیا تو دو کیمپوں میں بٹ گئی ہے، اب مجھے توفیق دے کہ سچے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾﴾ [التوبہ ۹:۱۱۹] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو''۔ آج تک اگر آپ کے اندر اللہ کا خوف نہیں تھا تو اب آنا چاہیے، اب تو قیامت کی نشانیاں بالکل سامنے آگئی ہیں۔ لہذا سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ، انہی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ حماس کے مجاہدین گویا آج کے دور میں صحابہ کرامؓ کے شاگرد ہیں۔ اگر صحابہ کرامؓ کے شاگرد دیکھنا چاہتے ہو تو حماس کے مجاہدین کو دیکھو۔ اس وقت یہی باتیں کافی ہیں ممکن ہے اتنا کچھ آپ لوگوں نے سیکھ لیا ہوگا جس سے ایک درست اور واضح تصور بن سکے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

The Islamic Response

We are Islamic revolutionaries. We oppose the sale of Pakistan's national sovereignty and the consolidation of capitalism's hold on the national economy. These initiatives are vital in this regard.

Mobilize the Masses for Resisting IMF Subservience

The IMF's forthcoming EFF package must be resisted through popular agitation at the mass level. If the program is not contested at the mass level the state will lose all economic authority and Pakistan will be thoroughly integrated within the imperialist financial system. It must be realized that all opposition to the existing order is meaningless and purposeless unless a massive political challenge is not launched to contest subordination to the IMF. The Tahreek-i-Insaf must be made to realize that its talk of "independence" is just an empty slogan unless Pakistan is not rescued from the IMF's fatal grip. A major weakness of the Tahreek-i-Insaf previoius administration was its signing of the EFF program for 2019-2023. It must be made to commit itself to never repeating this mistake in the future.

Supporting the *Halal* Sectors

The informal sector – this sector which does not pay direct taxes provides the core of the *halal* economy in the country. Three quarters of tax goes to finance interest payments by the government and are a means for the imposing of capitalist discipline on the *halal* economy. Islamic movements must develop institutional mechanisms for defending the non-tax filer – especially in the bazaars – from administrative and political persecution. We must also develop schemes for the promotion of *halal* business which is not linked to the money and capital markets and capitalist state surveillance.

pre-conditions for the loans.

The IMF primary concern is that as that Pakistan continues to service its domestic and foreign debt – so more than 50 percent of budgetary expenditure is allotted to interest payments. The budget deficit (6 percent of GDP) is entirely due to interest payments – there is a substantial surplus (over 2 percent of GDP on the primary budget) Virtually all precondition of the IMF has been met but the FBR chairman has stated that a mini budget will soon be introduced if the revenue targets set are not met in about three months. We can expect a mini budget at the time of the IMF's first EFF renew mission in September 2024. The Federal government net income after provincial principal share of taxes is only about Rs 600 billion, more than interest payments in Federal debt. Interest payments are 34 percent more than previous year's.

Total borrowing of the government is envisaged at Rs 8.5 trillion of cash RS 1-78 trillion is expected to be foreign borrowing. Government expects to borrow from foreign banks, imperialist governments and the European markets. Interest based domestic borrowing during the year is expected to approximate Rs 7 trillion. Foreign direct and portfolio investment is expected to be a major source of investment. The government is committed to selling of all national enterprises. In 2024-25 the privatization of PIA, FWC, coal and power distribution companies is targeted.

The government is committed to subordinating the national economy to imperialist finance and consolidating the capitalist grip on the domestic economy. It is selling out Pakistan's sovereignty to imperialist interests – both private sector investors and foreign governments, both of whom the IMF is currently serving on as the major agent of global capital.

non-tax filer has been banned. Increased taxes had been imposed on the utility bills and bank transactions of non-filers and imprisonment has been proposed for tax evaders. Shops would be raided and closed for this purpose.

Maximum indirect taxes constitute almost 60 percent of tax revenue. Increase in revenue from taxes is estimated at Rs500 billion. Another additional Rs 300 billion is to be raised from excise duties and a further Rs 200 billion from customs duties.

Excise duty has been imposed on sugar, cement and pulses. Taxes have been imposed on retail trade, real estate sector, exports, milk and computers. Petroleum levy has been increased from Rs 60 to Rs 80 per liter. Sales taxes have been imposed on stationery, fertilizers and tractors. Total revenue target is 40 percent higher than the previous year.

Penalizing non-filer and non-salaried individuals is a method for expanding the scope of the *haram* economy. Non-filers contain a large majority of those who avoid transactions with the *riba* based economy. They realize that the tax revenue is used predominantly for *riba* payments by the capitalist government .The interest payment of Rs 9.7 trillion is being financed by the Rs 13.1 trillion of tax receipts – i.e. 75 percent of tax revenues goes to finance interest payments of the capitalist government. Paying taxes is a means for strengthening the *haram* orientation of the Pakistani economy.

Impact with regard to imperialist subordination

The budget has been prepared under the shadow of the IMF and by the Dutch national banker who serves as Pakistan's finance minister. The purpose of the budget is to ensure that Pakistan finalizes a new EFF multiyear loan program with the IMF – the budget is meeting the

Dr. Javed Akbar Ansari

Implication of the 2024-25 Budget strategy for Islamic Movements

Islamic movements must learn to assess the macroeconomic strategies of the capitalist governments from their own perspective. We are committed to the Islamization of Pakistan's economy and society. Thus we must analyze macro-economic policies for identifying their impact on (a) the extent to which they initiate or promote the growth of the *Halal* segment of the national economy and (b) the extent to which they do or do not subordinate the national economy to imperialist markets.

Impact on the *Halal* economy

In 2023 the government committed itself to the abandonment of all interest financing by 2028 in accordance with the decision of the Shariah Court. There is no mention of this commitment in the budget and no measures have been announced to move to implement this decision. We may therefore conclude that the capitalist government has no intention to fulfil its commitment in this regard, not even an expansion of the scope of the fraud of Islamic banking.

On the contrary steps are being taken to expand the *haram* economy. On the one hand the tax net is being broadened and on the other hand taxation on non-salaried income is being increased.

The revenue target has been set at Rs.13 trillion – 36 percent higher than the previous year. The maximum tax threshold has been raised for non-salaried individuals and the tax rate has been raised to 45 percent – there is no increase in the corporate tax rate on capitalist businesses. Non-Tax filer have been subjected to a range of penalties. Foreign travel of